
چندر پرکاش جوہر بجنوری
اوراق گل

ہدیۂ خلوص برائے پبلک لائبریری خانیار سری نگر
منجانب سیف بجنوری



اشکوں کی بوند یار کی تصویر دیکھ کر
اوراقِ گل پہ صورتِ شبنم بکھر گئی



چندر پرکاش جوہر بجنوری

"یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومت اُتّر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون
سے شائع ہوئی"



پروردۂ آغوشِ محبت ہوں میں جوہر
دنیا کے مٹانے سے مٹوں گا نہ مٹا ہوں

چندر پرکاش جوہر بجنوری

جنہیں دُنیا مہ و انجم، گُل و لالہ سمجھتی ہے
یہ ہیں بکھرے ہوئے ذرّے مری خاکستر دل کے

— جوہر بجنوری

نام کتاب : اوراقِ گل

ناشر : چندر پرکاش جوہر بجنوری
۶- ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ- الہ آباد-۳

سالِ طباعت : ۱۹۸۶ء

مطبع : تاج آفسٹ پریس الہ آباد-۳

تعداد : چھ سو (۶)

کتابت : حافظ عبداللطیف

سرورق : محمد وقار صدیقی

تزئین کار : ذوالفقار صدیقی

مسودے زیرِ ترتیب : غزلیات کا دوسرا مجموعہ،
مکاتیبِ تسکین اور نعتوں کا مجموعہ

موجودہ پتہ : ۶- ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ،
الہ آباد-۳

قیمت : بیس (۲۰) روپے



کتاب ملنے کے پتے

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی 110025

۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار دلّی 110006

۳۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسیز بلڈنگ ای۔ آر۔ روڈ بمبئی 400003

۴۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونیورسٹی مارکیٹ ایم۔ یو۔ علی گڈھ 202001

۵۔ انجمن تہذیبِ نو پبلی کیشنز ۲۷۲ چک الہ آباد 210003

۶۔ کتابستان ۳۰ چک، الہ آباد 210003

۷۔ مکتبہ فروغِ اردو۔ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ 226018

۸۔ بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ 800004

۹۔ قاضی سیف الحق سیف بجنوری قاضی پاڑہ بجنور 246701 ✓

۱۰۔ بجنور ٹائمس بجنور 246701

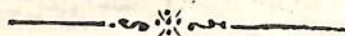
۱۱۔ اتر بھارت ٹائمس بجنور 246701

۱۲۔ چندر پرکاش جوہر بجنوری ۶۔ ریوا بلڈنگ لیڈر روڈ الہ آباد۔ ۳
211003

۱۳۔ مہیندر سرل، ۷ پتر کار باندرہ پورو بمبئی 400051

۱۴۔ شمع بک اسٹال گھنٹہ گھر۔ الہ آباد 211003

۱۵۔ رحمت نجمی، انڈیا آٹو موبائل خیر نگر۔ میرٹھ شہر 250002



فہرست

اِنتساب

مُحبِّ اُردو جناب ڈی۔ این۔ آریہ
انکم ٹیکس آفیسر کے

نام

جن کی ادب نوازی، انسان دوستی اور حُبّ الوطنی
ہمارے لئے نہ صرف باعثِ فخر ہے بلکہ
لائقِ تقلید بھی ہے

—— جوہرؔ بجنوری

عرضِ مصنّف

——— چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

۲۵ر مئی ۱۹۸۶ء

میں ۱۷ر فروری ۱۹۲۳ء کو شہر بجنور (اتر پردیش) کے ایک معزز برہمن گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرے والدِ بزرگوار پنڈت رام چند مرحوم ایک ممتاز اسکول ٹیچر تھے۔ ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بجنور سے اُردو فارسی کے ساتھ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد میرا سلسلۂ تعلیم کچھ معاشی مجبوریوں کے باعث منقطع ہوگیا۔ لیکن میں ذاتی طور پر مشاہدے اور مطالعے کے ذریعے اپنی معلومات اور علمی استعداد میں برابر اضافہ کرتا رہا۔

۱۹۴۳ء میں دوسری جنگِ عظیم کے دوران بہ سلسلۂ ملازمت میرٹھ آنے کا اتفاق ہوا۔ اُس زمانے میں یہاں کئی مشہور و معروف اساتذۂ فن موجود تھے۔ میری نگاہِ انتخاب اظہار حسین خاں اظہاؔر رام پوری (مرحوم) پر پڑی اور بالآخر مَیں انھیں کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگیا۔ مرحوم نہ صرف بہت سی خوبیوں کے مالک تھے بلکہ ایک مکمل صاحبِ فن کے علاوہ حافظِ قرآن بھی تھے۔ اُن کا مجموعۂ کلام ۱۹۷۳ء میں ماہ و انجم کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جسے میرے عزیز استاد بھائی جناب سیف الحق سیفؔ[1] بجنوری نے ترتیب دیا ہے۔ جناب عروج زیدی بدایونی اور جناب نشترؔ[2] خانقاہی نے موصوف

---

[1] بجنور کے ایک کہنہ مشق، بزرگ اور مشہور و معروف شاعر ہیں۔ آپ کا مجموعۂ کلام 'عکسِ نوا' کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہوچکا ہے۔ (جوہرؔ)

[2] ہندوستان کے مشہور و معروف جدید شاعر ہیں۔ آپ کے کئی مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جوہرؔ

کی شخصیت، فن اور شاعری کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

میں ۱۹۴۸ء میں بہ سلسلۂ ملازمت الہ آباد آیا تھا اور اب یہیں اے۔جی آفس سے ریٹائر ہونے کے بعد مستقل طور پر قیام پذیر ہوں۔

'اوراقِ گل' میرا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں ابتدائی دور سے موجودہ دور تک کی غزلیں شامل ہیں۔ ۱۹۷۰ء تک کی کہی گئی غزلوں کا انتخاب جناب تسکین[3] سوروونوی (مرحوم) نے اپنی زندگی ہی میں کر دیا تھا، نیز جا بجا اپنے مفید اور کارآمد مشوروں سے بھی نوازا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کی غزلوں کا انتخاب جناب حاجی محمد عثمانی[4] صاحب نے فرمایا ہے۔ اور اپنی گراں قدر رائے سے بھی نوازا ہے۔

میری شاعری کی داغ بیل ۱۹۴۰ء یعنی زمانۂ طالب علمی ہی میں پڑی اور میں اسی وقت سے برابر شعر کہہ رہا ہوں۔ یوں تو میں نے نعتیں۔ قصیدے اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔ لیکن غزل سے مجھے خاص لگاؤ رہا ہے۔ میرا کلام ہندوستان کے مختلف جرائد و رسائل میں برابر شائع ہوتا رہتا ہے، نیز ملک کے طول و عرض میں ہونے والے کل ہند مشاعروں میں بھی شرکت کرتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی ٹی۔وی اور ریڈیو کے پروگراموں میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

---

[3] مفصل نوٹ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت جگر مرادآبادی کا آخری مجموعۂ کلام 'آتشِ گل' آپ ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے۔
جوہر بجنوری

[4] حضرت شاہ اجملؒ صاحب کے خاندان کے ایک فرد ہیں۔ آپ کے والد مرحوم جناب قاضی سلطان علی صاحب فارسی زبان کے جید عالم تھے۔ عثمانی صاحب عربی، فارسی، اردو اور انگریزی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں بہ حیثیت پرنسپل گورنمنٹ کالج ریٹائر ہو کر اپنے آبائی وطن الہ آباد، دائرہ شاہ اجملؒ میں مقیم ہیں۔ آپ علم و فن، شعر و ادب اور تحقیق و تنقید میں انتہائی بلند حیثیت کے مالک ہیں۔ (جوہر)

نظریاتی طور پر میں ادب برائے زندگی یا شعر برائے زندگی کا قائل ہوں۔ ہر چند کہ میری شاعری کی بنیاد روایت کی اعلیٰ قدروں پر مبنی ہے لیکن میں صالح جدیدیت کا پرستار ہوں اور شاعری کو خانوں میں بانٹنے کا سخت مخالف۔ قدیم اور جدید کی بحث سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں شاعری کو صرف شاعری سمجھتا ہوں چاہے وہ کسی رنگ میں ہو۔ مشاہدہ، مطالعہ اور ذاتی تجربات کی روشنی میں عصری مسائل کا حل تلاش کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ غزل میں کھُردری زبان کا استعمال مجھے اس لئے ناپسند ہے کہ میں اُسے غیر معیاری تصور کرتا ہوں۔ زبان و بیان کی صحت پر خصوصی نظر رکھتے ہوئے میں نے ہمیشہ فن کا احترام کیا ہے۔ مجھے اس سلسلے میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے وہ اہلِ نظر جانیں۔

اس موقع پر میں اپنے دیرینہ کرم فرما اور بہترین دوست جناب مظہر نسیم صاحب کا ذکر کرنا اپنا ایک ادبی فریضہ سمجھتا ہوں۔ جناب مظہر نسیم صاحب ایک ممتاز و مقبول شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے نقاد اور ادیب بھی ہیں۔ فنِ شاعری پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ موصوف میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھے شاعر، نقاد اور ادیب میں پائی جاتی ہیں۔ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ نہایت وسیع ہے۔ وہ اپنے عہد کے ایک سچے اور کامیاب شاعر ہیں۔

۱۹۶۸ء میں جناب مظہر نسیم کی رہنمائی میں جناب نصر قریشی، جناب نظام صدیقی، جناب عابد حسین انصاری اور راقم الحروف نے مل کر "ادبستان" کے نام سے ایک ایسی ادبی انجمن بنائی تھی جو ۱۹۷۵ء تک انتہائی فعّال رہی اور جسے پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں اور ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی جیسی ادبی اور قدآور شخصیتوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ہم لوگوں نے

ان گنت ادبی جلسے کئے۔ مشاعرے، نشستیں، سیمینار اور سمپوزیم وغیرہ منعقد کر کے اُردو ادب کی ترویج وترقی کے لئے کچھ ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں جو الٰہ آباد کی ادبی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

آخر میں، میں اُن تمام مندرجہ ذیل ادبا و شعراء، احباب ومخلصین کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جو اکثر وبیشتر مجھے میرے کلام کی اشاعت کے لئے نہ صرف یاددہانی کراتے رہے بلکہ مسلسل تقاضا بھی کرتے رہے:۔

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، شمس الاسلام جعفری، رحمان نیر، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، رام لعل، ڈاکٹر فخر الکریم، افسر جمشید، سید انعام اللہ شاہ، امیر احمد صدیقی، راج نرائن راز، عابد علی خاں حیدرآبادی، شمیم جے پوری، صوفی زمزم بجنوری، دھرم پال عاقل، چودھری نیپال سنگھ آریہ، جوہر دیوبندی ڈی لٹ، شفیع اللہ خاں، راز اٹاوی، عمر قریشی، وقار بجنوری، شمس کنول، شفاعت علی، راج کمار جلین، راجیندر پال سنگھ کشپ، کرشن چندر مہریش، راجیندر بہادر موج فتحگڈھی، انور جلال پوری، شوق بجنوری، نور احمد خاں، شاہ آفتاب احمد، زاہد فاخری، ڈاکٹر سراج الدین احمد، تسنیم فاروقی، فنا کانپوری، سید عبدالکریم، رفیق احمد، برجیندر کوشک، ناصر فاخری، راہی شہابی، تنویر سید، اسرار گاندھی، عتیق الہ آبادی، حباب ہاشمی، خورشید افسر بسوانی، حکیم اختر زیدی، ناظم مصطفےٰ آبادی، اشوک مدھوپ، اسلم الہ آبادی، محمود رائے بریلوی، نیر عاقل، حفیظ میرٹھی، جمال الدین ساحل، محمد یوسف بجنوری، صمد انصاری، سید اختر الاسلام، سکھدیو شرما رشک، ارشاد احمد منے، مضطر نگینوی، افتخار امام، ریاض الہ آبادی، ساحر ہوشیارپوری، مہدی پرتاپگڈھی، والی آسی، حیات وارثی، بشیر فاروقی، محمد یونس قاری، پُتن بھائی، شکیل بجنوری، کرشن بہاری نور، ڈاکٹر جلال زبیری، راحت اندوری۔ رنجیت ایسر، بیکل اتساہی، محمد علی موج رامپوری، معراج فیض آبادی، سر بیندر روچ۔

جوہر بجنوری کی غزل گوئی

—— مظہر نسیم

الہ آباد ۲۰، مئی ۱۹۸۶ء

کسے خبر تھی کہ غزل قصیدے کی تشبیب سے نکل کر ایک علاحدہ صنفِ سخن بن جائے گی، اور پھر آہستہ آہستہ اتنا عروج حاصل کرلے گی کہ اسے اردو شاعری کی آبرو کہہ دیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ غزل ایک انتہائی مقبولِ عام صنفِ سخن ہے۔ اس کی مقبولیت کا سارا راز اس کی بے پناہ رمزیت اور ایمائیت میں پوشیدہ ہے۔ اس میں کتنی گہرائی اور کتنی گیرائی ہے اس کا محاسبہ کرنا کچھ آسان نہیں۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر میر و غالب تک اور میر و غالب سے لے کر فراق گورکھپوری تک آسمانِ ادب پر غزل کی ایک ایسی کہکشاں بکھری ہوئی ہے جس کی داستان بھلائے نہ بنے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن —" اس میں شاخِ گل کی لچک بھی ہے اور تلوار کی خارا شگافی بھی۔ اس میں عارض و لب کی حکایتیں بھی ہیں اور زلفِ گیتی سنوارنے کے ارمان بھی۔ فکر و فلسفہ بھی ہے اور وطن دوستی اور آزادی کا ولولہ بھی۔"

بیشتر شعراء کی طرح جوہر بجنوری نے بھی ۱۹۴۰ء کے آس پاس غزل ہی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور دھیرے دھیرے اس کے رموز و نکات سے

گہری واقفیت حاصل کرلی۔ بالآخر غزل اُن کے مزاج میں اس قدر رچ بس گئی کہ اُنھیں دُنیا کے ہر رنگ سے بہتر خیال یار کا رنگ نظر آنے لگا۔ ؎

ہر ایک رنگ یہاں جنّتِ نگاہ سہی
مگر عزیز ہے مجھ کو خیالِ یار کا رنگ

جوہر بجنوری ۱۹۴۸ء میں بہ سلسلۂ ملازمت بجنور سے الہ آباد آئے۔ یہاں آنے کے بعد اُنھیں ایک اچھا خاصا ادبی و شعری ماحول ملا جس میں اُن کی شاعری بلا شبہہ پروان چڑھی۔ اُس زمانے میں نوح ناروی، تحمّل الہ آبادی، محشر مرزاپوری، فراق گورکھپوری، شاہ حبیب الرحمٰن اختر الہ آبادی، مقصود رامپوری، منتظر الہ آبادی، عروض الہ آبادی، جمیل الہ آبادی، بسمل الہ آبادی، قتیل الہ آبادی، شعلہ کراروی، رونق الہ آبادی، سراج الہ آبادی، نشتر سلونوی، زوّار عباس اور ثمر بلوری جیسے بزرگ شعراء کی صحبتوں سے اگر ایک طرف اُنھیں فیض یاب ہونے کا موقع ملا تو دوسری طرف ڈاکٹر اجمل اجملی، اقبال ماہر، شبنم نقوی، مضطر مرزا پوری، حامد حسین حامد، شفیق الہ آبادی، ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، کے۔ بی۔ رائے رہبر، حمدون عثمانی، حمید قیصر، ماہر الجیدی، سہیل زیدی، راز الہ آبادی، شکور جاوید، فاروق جنوں، نصر قریشی، سراج مرزاپوری، ضمیر احسن، یوسف محشری، ایم۔ اے۔ قدیر، فضیل جعفری، شمیم اعظمی، انعام حنفی، حسیب رہبر پرتاب گڈھی، شید ابلیاوی، عزیز الہ آبادی، اکمل اجملی، اقبال دانش، ارمان غازی پوری، رئیس فراز، فرخ جعفری اور احترام اسلام جیسے ہم عصر شعراء کا ایک وسیع حلقہ بھی ملا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر سید محمد عقیل اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسی بلند قامت ادبی شخصیتوں کی صحبتوں سے اکتسابِ فیض کر کے اپنے نقطۂ نظر اور تنقیدی شعور میں

گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔

جوہر بجنوری میرے دیرینہ دوستوں میں ہیں۔ میں اُن کی دوستی پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ اگر میں انھیں یار بے ریا کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ میرے خیال میں ہم لوگ ایک دوسرے سے ۱۹۵۱ء سے بخوبی واقف ہیں اور جب کبھی مل بیٹھتے ہیں تو شعر کے معائب و محاسن، تدریجی ارتقا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر گھنٹوں گفتگو جاری رہتی ہے۔ جوہر صاحب صرف ایک مشہور و معروف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہترین انسان بھی ہیں۔ ان کے دل میں تہذیب و اخلاق، خلوص و محبت، بقائے انسانیت اور اس کے فروغ و تحفظ کے لئے کتنا درد ہے، حسب ذیل اشعار کے آئینے میں ملاحظہ فرمائیں:

دل میں ہے مِرے جذبۂ تعمیر محبت　　انسان ہوں انسان کا غم لے کے اُٹھا ہوں
اب خدا جانے کہاں انسانیت گم ہوگئی　　آدمیت کی کمی ہے آدمی کے شہر میں
چمن اخلاص و محبت کے کھلا دو یارو　　دل کے ہر زخم کو اک پھول بنا دو یارو
تو اگر انسان ہے انسان کی عظمت سمجھ　　کون برتر ہے یہاں اور کون کمتر بھول جا

اس میں شک نہیں کہ دیارِ گنگ و جمن صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی علمی و ادبی انجمنیں اپنی کارکردگی کے لئے ہر دور میں امتیازی حیثیت کی مالک رہی ہیں۔ اتفاق سے اسی گہوارے میں جوہر بجنوری کی ذہنی، شعری و تخلیقی تربیت کچھ اس طرح سے ہوئی کہ وہ ادب کی شاہراہ پر چل پڑے اور دھیرے دھیرے ہندوستان گیر شہرت حاصل کرلی۔ ان کا کلام ہندوستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں ایک زمانے سے شائع ہورہا ہے۔ وہ آل انڈیا مشاعروں میں برابر شرکت کرتے رہتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔

زیرِ نظر مجموعۂ کلام "اوراقِ گل" کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جوہر بجنوری کی شاعری کی بنیاد روایت کی صالح اقدار پر ہے۔ ان کے یہاں روایت سے روگردانی کا جذبہ نہیں ملتا۔ دراصل وہ اعلیٰ روایات کی روشنی میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین ؎ "ادب اپنی روایات و سرمایۂ قدیم کا بارِ احسان لے کر آگے بڑھتا ہے۔"

جوہر بجنوری نے اپنے تخلیقی سفر میں بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کے نقطۂ نظر کو اپنایا اور ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کے طوفان میں نہ بہہ کر جدیدیت کی صالح اقدار کو اپنے دل میں جگہ دی۔ بہرحال انھوں نے بیچ کی راہ اختیار کی اور برابر وقت کے دھارے کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گذرتے رہے۔ تجربات حاصل کرتے رہے۔ گرد و پیش کے واقعات و حادثات سے متاثر ہوتے رہے اور انھیں ایک باشعور شاعر کی طرح انتہائی سنجیدگی، سچائی اور دیانت داری کے ساتھ اپنے اشعار میں ڈھالتے رہے، اور اس طرح ڈاکٹر سید محمد عقیل کے اس قول کی بھرپور ترجمانی کرتے رہے کہ ہر باشعور شاعر اپنے وقت کی آواز ہوتا ہے اور خود کو اپنے گرد و پیش سے الگ نہیں کر سکتا۔ وہ حالات سے متاثر ہوتا ہے بشرطیکہ دلِ زندہ اور بیدار حس رکھتا ہو۔ اس تناظر میں چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

اشعار ہیں جن کے نئے افکار نہیں ہیں
شاعر ہیں مگر آج کے فن کار نہیں ہیں

اس دور میں جینے کا سلیقہ ہے اسی کو
جو وقت کی آواز میں آواز ملا دے

ہر دل میں ہے اک آتشِ خاموش فروزاں
یہ گھر کی تباہی کے تو آثار نہیں ہیں

وہ چمک رہا ہے سر پہ نئی زندگی کا سورج — ہیں غضب کے سونے والے انھیں کچھ خبر نہیں ہے
شعلوں میں بسر کرنا دشوار سہی لیکن — تعمیرِ نشیمن کو بجلی کی ضرورت ہے

جوہر بجنوری کے یہاں تصوّف، تغزّل، حبّ الوطنی، حرّیت پسندی، وفا پرستی، درسِ عمل اور جد و جہد کے بیشتر نمونے ملتے ہیں جو ان کے شعری نظریات اور فن کارانہ صلاحیتوں کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:[۵]

رضائے دوست میں گم ہو کے رہ گیا ہوں میں — وصال و ہجر کی شرطیں مری بلا جانے
معجزے ہیں یہ تمھارے نام کے — پھر گئے رُخ گردشِ ایام کے
مجھے ڈر ہے چھین نہ جائے مری بیکسی کی عظمت — کہیں آپ کا تصور مجھے دے نہ دے سہارا
نہ جانے عشق کی منزل بھی کیسی منزل ہے — تمام عمر چلے پھر بھی فاصلے ہیں بہت
چمن میں جب وقارِ لالہ و گل کا سوال آیا — تو پھر ہم نے لہو دے کر چمن کی آبرو رکھ لی
زندگی عشرتِ پیہم ہی نہیں ہے جوہر — زندگی جہدِ مسلسل کی طلب گار بھی ہے
پرچمِ نو بلند کر، نغمۂ انقلاب چھیڑ — معرکۂ حیات میں دار و رسن کی بات کر
شہرِ ستم سے ہے جوہر ربطِ بے پایاں مجھے — عمر گذری ہے اسی رعنائیوں کے شہر میں

مختصر یہ کہ جوہر بجنوری ایک خالص غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری قدیم و جدید رنگِ شاعری کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کی رنگینیاں بھی ہیں اور رعنائیاں بھی۔ حدیثِ دل بھی ہے اور حدیثِ دیگراں بھی۔ غمِ جاناں کی چاشنی بھی ہے اور غمِ دوراں کی لذت بھی۔ خیال کی پاکیزگی بھی ہے اور جذبے کی صداقت بھی۔ روشنی کی جستجو بھی ہے اور اندھیروں سے لڑنے کا حوصلہ بھی۔ زندگی کے نت نئے تجربے بھی ہیں اور عصری آگہی کے نمونے بھی۔ فکر و نظر میں گہرائی بھی ہے اور تنوع بھی۔ زبان و بیان میں سلاست بھی ہے۔ اور اسلوب میں ندرت بھی۔ نئی علامتیں بھی ہیں اور نئے اشارے کنائے

بھی۔ فن کارانہ مہارت بھی ہے اور پیکر تراشی بھی۔ بہ طورِ مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں: ؎

شعورِ عشق، شعورِ وفا، شعورِ حیات
ملی ہیں نعمتیں کیا کیا تری نظر سے مجھے

باوقار لہجے میں بڑا اثر کہا جائے
دل کا حال کچھ بھی ہو مختصر کہا جائے

یاد آتے ہی تری آئے خیالوں کے ہجوم
ایک پیکر سے تراشے گئے پیکر کتنے

اک شخص جو اس بھیڑ میں حیران کھڑا ہے
ہر شے سے ہے واقف مگر انجان کھڑا ہے

کیوں نہ ہم بدل ڈالیں کہنہ اصطلاحوں کو
کیوں نہ آج قاتل کو چارہ گر کہا جائے

بڑھ گئی اتنی تمازت آگہی کی دھوپ میں
زندگی خود جل رہی ہے زندگی کی دھوپ میں

میں تیرگی سے گذرتا ہوں روشنی کی طرح
مجھے شعور ہے جینے کا آدمی کی طرح

یوں دل کی وادیوں سے گذرتی ہے اس کی یاد
جیسے اترتی دھوپ کا منظر دکھائی دے

ایسے بھی مسافر ہیں خود جن کے لئے صدیوں
راہیں بھی ترستی ہیں منزل بھی ترستی ہے

پھر دل پہ پھینک دے نہ کوئی بے رخی کا سنگ
شیشے کا اک مکان ہے پتھر کے آس پاس

غزل کے ساز پہ رکھ دیں جب انگلیاں میں نے
بکھیر دیں غمِ دوراں کی دھجیاں میں نے

یہ شخص جس کے تبسم میں زخم پنہاں ہیں
غمِ حیات کا مارا دکھائی دیتا ہے

زندگی کیا ہے فقط اک جلتی بجھتی دھوپ چھاؤں
ہم ہیں سائے کی طرح پرچھائیوں کے شہر میں

ظلمات میں ابھرے گی اک تازہ کرن جوہر
احساس کے سانچے میں اشعار کو ڈھلنے دو

مجھے یقین ہے کہ جوہر بجنوری کا یہ اوّلین شعری مجموعہ جوان کے ۴۵ سالہ تخلیقی سفر کا آئینہ ہے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ میں انھیں اس مجموعۂ کلام کی اشاعت پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔



تسکین[۱]

بنام جوہر بجنوری

سوروں ضلع ایٹہ ۳۰.۳ / ۵۷

مجبی و عزیزی! دعاہا، خطِ ملفوف کا جواب اصولاً کارڈ نہیں ہو سکتا۔ مگر لفافہ میں کیا لکھ کر بھیجوں۔ حالات غیر دلچسپ، ماحول شاعری کے لئے ناسازگار۔ جب سے یہاں آیا ہوں ایک مصرعہ تک نہیں کہا۔ البتہ ایک مفید کام ہو گیا۔ انجمن ترقی اُردو موجودہ دور کے مشہور شعراءؔ کے کلام کا انتخاب شائع کر رہی ہے، آثر، جذبی وغیرہ کا انتخابِ کلام شائع ہو چکا ہے۔ جگرؔ صاحب کے مطبوعہ کلام کے انتخاب کے لئے مجھے منتخب کیا گیا تھا، سو آج اُس کی تکمیل ہو گئی، اسی کام میں اب تک لگا ہوا تھا۔ انتخابِ کلام ابھی ابھی سرورؔ[۲] صاحب کی خدمت میں ڈاک سے بھیجا ہے۔

آپ کی غزل[۳] بہت خوب ہے۔ آپ کہتے ہی اچھا ہیں۔ متانت اور

---

[۱] الحاج جناب محمد لیٰسین قریشی تسکینؔ مرحوم سوروں ضلع ایٹہ کے رہنے والے تھے اور حضرت عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جناب جگرؔ مراد آبادی سے ان کے نہایت قریبی تعلقات تھے۔ جگرؔ صاحب کا آخری مجموعۂ کلام "آتشِ گُل" انھوں نے ہی مرتب کیا تھا۔ جون ۱۹۷۱ء میں انتقال فرمایا۔

[۲] جناب آل احمد سرورؔ ہندوستان کے مشہور نقاد اور شاعر ہیں۔

[۳] میں نے یہ غزل جس کا مطلع یوں ہے: کیسا قرب کہاں کی دوری ؛ عشق میں دونوں غیر ضروری خط میں لکھ کر بھیجی تھی جو اس مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔

شائستگی اگر غزل میں نہ ہو تو میں اُس کو ذہنی عیاشی سمجھتا ہوں۔ نوجوان شعراء میں آپ اور دو تین حضرات کے علاوہ بقیہ سب کے سب اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ مضطر[۴] صاحب کی خدمت میں میرا بھی سلام کہہ دیں۔ آپ کا خط ملنے سے قبل میرٹھ کے سول سرجن کی چٹھی موصول ہوئی تھی۔ ۹/اپریل کو مجھے ڈاکٹری معائنہ کے لئے میرٹھ بلایا ہے۔ اگرچہ رمضان کا مہینہ ہوگا۔ مگر جانا پڑے گا۔ میں نے حکیم سیف الدین[۵] کو لکھا تو ہے کہ وہ سول سرجن سے مل کر مئی کی کوئی تاریخ مقرر کرا دیں، مگر اس کی امید بہت کم ہے۔ بہرحال ڈاکٹری معائنہ کی کیفیت سے آپ کو مطلع کروں گا۔ اپنا کلام ہر خط میں ضرور لکھتے رہیے۔ والسلام

تسکینؔ



---

[۴] جناب مضطر مرزاپوری حضرت محشر مرزاپوری کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ مشہور اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔

[۵] جناب حکیم سیف الدین احمد میرٹھی نہ صرف میرٹھ بلکہ ہندوستان کے ایک مشہور و معروف حکیم ہیں۔ جناب تسکینؔ مرحوم اور جناب جگرؔ مرحوم سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ آپ پدم شری ہونے کے علاوہ صدر جمہوریۂ ہند کے اعزازی معالج بھی ہیں۔ — جوہرؔ

جوہر بجنوری ـــ ایک کامیاب شاعر

حاجی محمد عثمانی

(ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ کالج)

دائرہ شاہ اجمل۔ الہ آباد ۲۵ اپریل، ۱۹۸۶ء

یادش بخیر۔ ایک زمانہ تھا جب میرے بھائی مفتی محمد اسلم صاحب (مرحوم)[1] کے پاس تقریباً روزانہ شام کو دائرۂ شاہ اجمل میں ایک نوجوان شاعر آیا کرتے تھے۔ بھائی صاحب کو شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ حضرتِ جگر مرادآبادی (مرحوم) اور جناب عارف عباسی (مرحوم) بھی اکثر ان کے یہاں تشریف لاتے اور محفلِ شعر و سخن گرم رہتی، میں بھی حاضر رہتا اور یہ نوجوان شاعر بھی شریکِ محفل رہتے۔ بھائی صاحب مرحوم نے بتایا کہ یہ نوجوان لیکن پختہ کار شاعر جناب جوہر بجنوری ہیں۔ جوہر صاحب کو میں نے پہلی بار یہیں سُنا، سُننے کے بعد ایسا محسوس ہوا کہ جوہر صاحب ایک دن ضرور دُنیائے ادب میں اپنا نام روشن کریں گے۔
کچھ عرصے کے لئے میرا تبادلہ الہ آباد سے باہر ہو گیا۔ جب واپس آیا تو معلوم ہوا کہ جوہر صاحب کی شہرت بامِ عروج تک پہنچ چکی ہے۔ اب وہ نہ صرف

---

[1] حضرت شاہ اجمل کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ادبی اور علمی ذوق خاندانی وراثت میں ملا تھا۔ حضرتِ جگر مرادآبادی سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور حضرتِ اصغر گونڈوی (مرحوم) کے انتقال کے بعد جگر صاحب جب بھی الہ آباد تشریف لاتے انھیں کے یہاں قیام فرماتے۔ ۱۹۸۰ء میں انتقال فرمایا ـــ حاجی محمد عثمانی۔

الہ آباد بلکہ ہندوستان کے مختلف کل ہند مشاعروں میں مسلسل شریک ہوتے ہیں۔ اور ملک گیر شہرت کے مالک بن چکے ہیں۔ ان کا کلام مختلف جرائد و رسائل میں برابر شائع ہونے لگا ہے۔ ٹی۔ وی اور ریڈیو پر بھی سُنے جانے لگے ہیں۔

مجھے جوہر صاحب کے کلام میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم نظر آتی ہیں جو ایک کہنہ مشق شاعر کے یہاں ہونی چاہئیں۔ ان کے کلام میں جدید اور قدیم شاعری کا خوبصورت امتزاج ہے۔ لب و لہجہ نہایت سادہ اور پُرکار ہے۔ زبان و بیان کی صحت پر خاص نظر رکھتے ہیں۔ مذاقِ سخن غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ دامنِ فن کسی مقام پر ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ جوہر صاحب نے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا لحاظ رکھتے ہوئے عصری مسائل کو اپنی غزلوں میں بڑی خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

میری دلی دعا ہے کہ پنڈت چندر پرکاش جوہر بجنوری کا کلام پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت تلوک چند محروم، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی، پنڈت بالمکند عرش ملسیانی، پنڈت آنند نرائن ملّا، پنڈت جگن ناتھ آزاد اور پنڈت آنند موہن گلزار زتشی دہلوی وغیرہ کی طرح قبولِ عام کی سند حاصل کرے اور وہ اُردو ادب کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں۔



دیباچہ

ڈاکٹر سیّد محمد عقیل
صدر شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی

۱۲ ستمبر ۱۹۸۳ء

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری سے میں پچیس۲۵ تیس۳۰ برسوں سے متعارف ہوں۔ وہ الہ آباد کے ایک مشہور اور مقبول شاعر ہیں۔ الہ آباد کے مشاعروں، یہاں کی ادبی محفلوں اور انجمنوں میں اکثر اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ وہ کب سے شاعری کر رہے ہیں۔ مگر جب جب مشاعروں میں شرکت کی ایسا محسوس ہوا کہ الہ آباد کے مشاعروں کی محفلیں جوہر صاحب کے بغیر مکمّل نہیں سمجھی جاتیں'۔ وہ خالص غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی ہزار شیوگی کے عاشق۔ غزل نے بہت سرد و گرم زمانہ دیکھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جدیدیت کی لہر آئی اُس میں بہت سے اچھے اچھے شاعر اپنی چال بھول گئے۔ اُنھیں شوقِ شہرت ایسا لے اُڑا کہ اپنے رنگ اور اپنے فن کی حُرمت کا خیال بھی نہ رہ گیا۔ جوہر صاحب اُس وقت بھی میانہ روی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن رہے۔ انھیں غزل کی روایت اور مزاج کا جو عرفان ہے اور جس طرح انھوں نے اس کا ادراک کیا ہے

اُس سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا، اُن کی شاعری کلاسیکیت، نغمگی اور سہل ممتنع سے عبارت ہے۔ یہی صورت اُن کے تغزّل کی تکمیل کرتی ہے اور یہ اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب شاعر کو اپنے رنگ اور غزل کے کلاسیکی مزاج کی تحریم کا احساس ہو اور یہ صورت جوہر بجنوری کے ہر دور کے کلام میں اوّل سے آخر تک دیکھی جا سکتی ہے جو ان کی انفرادیت بنتی ہے۔

جوہر صاحب نے ہر دور کے رنگِ سخن کو پرکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہر رنگ نے انھیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی ہو۔ ایک زمانہ تھا جب وہ فراق صاحب کی صحبتوں میں رہے ہیں۔ فراق صاحب سے بہت سے لوگوں نے فیضِ سخن حاصل کیا، ان کا رنگ اڑانے کی کوشش بھی کی اور اُن کی وساطت سے اپنی شہرت میں اضافے کی فکر بھی۔ مگر جوہر صاحب نے کبھی یہ صورت اختیار نہ کی۔ نہ فکرِ سخن میں انھوں نے فراق صاحب کے اثر کو قبول کیا اور نہ اُن سے کسی دُنیاوی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ سیدھے سادے جوہر صاحب کا جوہرِ ذاتی ہے۔ وہ اپنے رنگ اور اپنے آہنگ پر قائم رہے کہ اُسی میں اُن کی فلاح اور انفرادیت تھی۔

غزل سے طرح طرح کے تقاضے ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ اصلاً غزل داستانِ حسن و عشق رہی ہے اور حدیثِ دل کے طور طریقوں نے ہی اچھی اور بُری غزل کے معیار کو قائم کیا ہے لیکن فلسفہ و حکمت، شکایت و حکایتِ زمانہ اِس میں اس طرح در آئے ہیں کہ نہ غزل کہنے والا اُسے بچا سکتا ہے اور نہ سُننے والا اُسے سن کر اپنی کیفیت کو روک سکتا ہے۔

اب شاعر کی اُستادی اور اُس کے عرفان کا امتحان یہیں ہوتا ہے کہ اُس نے

اِن کیفیات کا ادراک کس طرح کیا ہے۔ مشاہدہ، مطالعہ اور زندگی کے ذاتی تجربات کی روشنی میں یا غزل کے بُنیادی تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ جوہر صاحب نے تمام صورتوں کو بہت سوچ سمجھ کر بڑے حسن و خوبی سے نبھایا ہے۔ یہاں چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں :

یوں دل کی وادیوں سے گذرتی ہے اُس کی یاد
جیسے اُترتی دھوپ کا منظر دکھائی دے

آج کا دَور خود انسان سے جینے کے لئے
قلب آہن کا تو پتھّر کا جگر مانگے ہے

ایسے بھی مسافر ہیں خود جن کے لئے صدیوں
راہیں بھی ترستی ہیں منزل بھی ترستی ہے

جو تری راہ، تری انجمن سے گذرے ہیں
وہ پہلے منزلِ دار و رسن سے گذرے ہیں

چمن میں پھول تو کھلنے کو کھل گئے لیکن
ابھی لہو کی ضرورت ہے رنگ و بو کے لئے

کیا قحطِ محبّت ہے کہ بازارِ جہاں میں
اِک بھیڑ ہے ہر سمت خریدار نہیں ہیں

یاد چاہے جس طرح کہئے ختم ہو نہیں سکتا
عشق وہ فسانہ ہے عمر بھر کہا جائے

مری نظر میں ہے جب سے ترے شباب کا رنگ
اڑا اڑا نظر آتا ہے ماہتاب کا رنگ

بڑھ گئی اتنی تمازت آگہی کی دھوپ میں
زندگی خود جل رہی ہے زندگی کی دھوپ میں

حسنِ قبا یہ لالہ و گل بھی ہیں دم بخود
اب کیا کوئی بتائے ترے پیرہن کی بات

یاد آتے ہی تری آئے خیالوں کے ہجوم
ایک پیکر سے تراشے گئے پیکر کتنے

ہم وہ اسیر تھے کہ رہائی کے بعد بھی
بیٹھے رہے قفس میں غمِ بال و پر لئے

کچھ دیر خیالوں کی گھنی چھاؤں میں رُک کر
جانا ہے کدھر یہ میں ابھی سوچ رہا ہوں

جنھیں دُنیا مہ و انجم، گل و لالہ سمجھتی ہے
یہ ہیں بکھرے ہوئے ذرّے مری خاکسترِ دل کے

میں تیرگی سے گذرتا ہوں روشنی کی طرح
مجھے شعور ہے جینے کا آدمی کی طرح

یہ اور ایسے، اور اشعار جوہر صاحب کی شاعری اور اُن کے فکرِ سخن کو سمجھنے میں خاصی مدد کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جوہر صاحب کے کلام کی اشاعت سے کچھ اچھے شعر اردو کے ایوانِ غزل میں اور شامل ہو سکتے ہیں۔

جوہر بجنوری کی غزل

پروفیسر جگن ناتھ آزاد
شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی جموں
۲ر ستمبر ۱۹۸۵ء

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری کی غزل کا مطالعہ میں سالہا سال سے کر رہا ہوں۔ رسالوں میں بھی اُن کی غزل نظر سے گذرتی رہی ہے اور مشاعروں میں بھی خود اُن کی زبان سے سنتا رہا ہوں۔ مجھے ان کی شعریت میں رچا بسا اندازِ بیان ہمیشہ پسند آیا ہے۔

اُن کے کلام کی جس خوبی نے مجھے خاص طور سے متأثر کیا ہے وہ اُن کا متوازن لہجہ ہے۔ یہ متوازن لہجہ کسی بھی شاعر کے لئے بہت بڑی دولت ہے اور یہ بغیر ریاضت کے ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن اس کے لئے ریاضت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" والی بات کا ہونا بھی ضروری ہے اور جوہر صاحب کی غزل سے یہ حقیقت بخوبی نمایاں ہے۔ یہ سعادت انھیں محض ریاضت سے حاصل نہیں ہوئی اس کے لئے خدائے بخشندہ والا اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

جوہر بجنوری کی غزل روایت کے احترام کی ایک خوبصورت مثال ہے لیکن روایت کا احترام اپنی حدود میں رہا ہے اور یہی جوہر صاحب کی غزل کا حُسن

ہے۔ روایت کی پابندی انھوں نے اس طرح سے نہیں کی کہ روایت کے اسیر ہو کر رہ جائیں۔ اس لئے ان کی غزل قدیم وجدید کا ایک ایسا خوبصورت امتزاج بن گئی ہے کہ یہ ہر قاری کو متاثر کرتی ہے۔ یہ کسی بھی شاعر کا بڑا کمال ہے کہ اُس کے کلام میں روایت کے تمام محاسن بھی موجود ہوں اور وہ جدّت کے اُن معائب سے بھی پاک ہو جو جدّت کو نام نہاد جدّت کے حدود میں لے آتے ہیں اور جوہر صاحب کو یہ کمال حاصل ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں جوہر بجنوری کے چند اشعار دیکھئے کہ بے اختیار دل میں اترتے جا رہے ہیں۔

اِک شخص جو اُس بھیڑ میں حیران کھڑا ہے
ہر شے سے ہے واقف مگر انجان کھڑا ہے

کچھ ایسے کم نصیب بھی ہیں اس جہان میں
پیاسے کھڑے ہوئے ہیں سمندر کے آس پاس

یاد آتے ہی تری آئے خیالوں کے ہجوم
ایک پیکر سے تراشے گئے پیکر کتنے

روش روش پہ جہاں آج گُل کھِلے ہیں بہت
اسی چمن سے ہمیں زخم بھی ملے ہیں بہت

اِس نئے اُجالے سے تیرگی ہی بہتر تھی
روشنی کے دیوانو! کیا یہی سویرا ہے

آج کا دَور خود انسان سے جینے کے لئے
قلب آہن کا تو پتھّر کا جگر مانگے ہے

کیوں نہ ہم بدل ڈالیں کہنہ اصطلاحوں کو
کیوں نہ آج قاتل کو چارہ گر کہا جائے
دھوپ پہلے بھی نکلتی تھی یہی موسم بھی تھا
اس قدر شدت کہاں تھی زندگی کی دھوپ میں
روشنی بھی اب مجھ کو تیرگی سی لگتی ہے
وقت کے اُجالوں میں کچھ کمی سی لگتی ہے
رفتارِ زمانہ کو آواز میں ڈھلنے دو
صدیوں کی مسافت کو لمحوں میں بدلنے دو
میں تیرگی سے گذرتا ہوں روشنی کی طرح
مجھے شعور ہے جینے کا آدمی کی طرح
دریا کی حیثیت اُسے کیونکر دکھائی دے
ایک ایک قطرہ جس کو سمندر دکھائی دے
ایسے بھی مسافر ہیں خود جن کے لئے صدیوں
راہیں بھی ترستی ہیں، منزل بھی ترستی ہے
چمن میں پھول تو کھلنے کو کھل گئے لیکن
ابھی لہو کی ضرورت ہے رنگ و بو کے لئے
اشعار میں جن کے نئے افکار نہیں ہیں
شاعر ہیں مگر آج کے فن کار نہیں ہیں
غزل کے ساز پہ رکھ دیں جب انگلیاں میں نے
بکھیر دیں غمِ دوراں کی دھجیاں میں نے

یہ اُن کے مجموعۂ کلام "اَوراقِ گُل" کا انتخاب نہیں ہے بلکہ مسودہ پر ایک نظر ڈالنے سے چند اشعار جو میرے سامنے آئے ہیں میں نے لکھ دئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر جوہر بجنوری کے کلام کا ایک کڑا انتخاب کیا جائے تو وہ کسی قدر بلند پایہ شاعری کا حامل ہوگا اس لئے یہ اشعار درج کرتے وقت کڑے انتخاب والا اصول اپنے سامنے نہیں رکھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ اِدھر اُدھر سے لئے ہوئے اشعار بھی اس قدر دلکش اور دل آویز ہیں کہ ہم انھیں منتخب کلام کا درجہ دے سکتے ہیں۔ کسی بھی مجموعۂ کلام کا انتخاب ہر قاری کا اپنا اپنا ہوتا ہے اس لئے قاری اور شاعر کے درمیان حائل ہونا کسی بھی تمہید نگار کے فرائضِ منصبی میں داخل نہیں ہے۔ اس مجموعۂ کلام کے مسودہ پر نظر ڈالنے کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ: ~

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اور مجھے یقین ہے کہ "کرشمہ" ہر قاری کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچتا چلا جائے گا۔



A scene of a Mushaira held at Allahabad.
Jauhar Bijnori may be seen while reciting his poem.



From left to right :—Dr. Jagannath Azad, Wamiq Jaunpuri, Ali Sardar Jafri, Hameed Qaisar, Nazish Pratapgarhi, Chandra Prakash Jauhar Bijnori, Firaq Gorakpuri, Maulana Anwar Sabri, Shafaat Ali, Siraj Mirzapuri, Qamar Moradabadi, Ramesh Chandra Divedi, Allama Raaz Allahabadi and Wasim Bareillvi etc.

With Thanks to A.I.R. Allahabad

نعتِ پاکؐ

خم جس کی فضیلت پہ دو عالم کی جبیں ہے
سجدہ گہِ کونین وہ طیبہ کی زمیں ہے
اتنا کوئی اللہ کو محبوب نہیں ہے
صورت بھی حسیں، آپؐ کی سیرت بھی حسیں ہے
دُنیا کا عقیدہ بھی ہے اپنا بھی یقیں ہے
جو بات ہے طیبہ میں کہیں اور نہیں ہے
یہ ارض مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
جنّت بھی یہیں مالکِ جنّت بھی یہیں ہے
اے خاکِ مدینہ ترے اعجاز کے صدقے
ہے عرش نشیں جو بھی یہاں فرش نشیں ہے
جس نے نہ کیا گنبدِ خضرا کا نظارہ
وہ آنکھ حقیقت میں کوئی آنکھ نہیں ہے
کیوں گُلشنِ طیبہ میں کروں خواہشِ جنّت
کیا خُلدِ بریں اس کے سوا اور کہیں ہے
اللہ کے دیدار سے محروم رہے گا
دیدارِ نبیؐ کا جسے ارمان نہیں ہے
جوہؔر کوئی عالم ہو ازل ہو کہ ابد ہو
ہر حال میں دل سرورِ عالم کے قریں ہے

غزلیات



ہر سمت سے طوفانِ حوادث میں گھرا ہوں
پھر آج تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہوں
مصروفِ دُعا میں ہوں، نہ مایوسِ دُعا ہوں
خود حوصلہ رکھتا ہوں میں خود عقدہ کشا ہوں
جس دور میں جینا کوئی آسان نہیں ہے
اُس دور سے جینے کا صلہ مانگ رہا ہوں
دل میں ہے مرے جذبۂ تعمیرِ محبّت
انسان ہوں، انسان کا غم لے کے اٹھا ہوں
پستی و بلندی کے مناظر کو ملا کر
میں کچھ نئی راہوں کی بِنا ڈال رہا ہوں

یاد آئی ہیں مجھ کو مری گم گشتہ منازل
جب بھی کسی بھٹکے ہوئے راہی سے ملا ہوں

فردا کی حقیقت کا تو احساس نہیں ہے
ماضی کے فسانوں پہ فقط جھوم رہا ہوں

تاریخ کے جھلسے ہوئے اوراق کو دیکھو
یہ مجھ سے نہ پوچھو کہ میں کس طرح جیا ہوں

کچھ دیر خیالوں کی گھنی چھاؤں میں رُک کر
جانا ہے کدھر یہ میں ابھی سوچ رہا ہوں

ہر سو مرے نغموں سے ہیں معمور فضائیں
کہنے کو میں اک سازِ شکستہ کی صدا ہوں

پروردۂ آغوشِ محبت ہوں میں جوہر
دنیا کے مٹانے سے مٹوں گا نہ مٹا ہوں



کون جانے کہ تخیّل میں ہیں پیکر کتنے
بُت تراشے گا ' ابھی اور یہ آزر کتنے

ہم نے اک قطرہ کا ' احسان گوارا نہ کیا
پی گئے لوگ خُدا جانے سمندر کتنے

یاد آتے ہی تری، آئے خیالوں کے ہجوم
ایک پیکر سے، تراشے گئے پیکر کتنے

ہو وہ مذہب کا لبادہ، کہ سیاست کا لباس
لوگ پھرتے ہیں یہاں بھیس بدل کر کتنے

شہر پھولوں کا جسے، ہم نے سمجھ رکھا تھا
ہم پہ پھینکے گئے اُس شہر میں پتّھر کتنے

جو کچھ اِن آنکھوں نے دیکھا ہے وہی کیا کم تھا
اور دیکھیں گے ابھی دیکھیے منظر کتنے

ایک ساقی کے نہ ہونے سے ہے ماحول اُداس
آج توڑے گئے میخانے میں ساغر کتنے

بجلیاں گرتیں چمن پر تو کوئی بات نہ تھی
آتشِ گل نے جلائے ہیں یہاں گھر کتنے

دل وہ قطرہ ہے کہ ہستی نہیں جس کی محدود
اسی قطرے میں ہیں پوشیدہ سمندر کتنے

ایک تم ہی نہیں دُنیائے ادب میں جوہر
ہیں اسی بحر میں کیا جانئے گوہر کتنے



باوقار لہجے میں، پُر اثر کہا جائے
دل کا حال کچھ بھی ہو مختصر کہا جائے
وسعتِ تخیّل کو، بال و پر کہا جائے
شوق کی بلندی کو، بام و در کہا جائے
کیوں نہ ہم بدل ڈالیں، کہنہ اصطلاحوں کو
کیوں نہ آج قاتل کو، چارہ گر کہا جائے
زندگی کی راہوں میں، کون ساتھ دیتا ہے
کس کو اس مسافت میں، ہمسفر کہا جائے
جس طرف سے وہ گذریں، بس وہ رہگذر ٹھہرے
عام راستے کو کیوں، رہگذر کہا جائے

چاہے جس طرح کہیئے، ختم ہو نہیں سکتا
عشق وہ فسانہ ہے، عمر بھر کہا جائے

وہ چمن ہو یا صحرا دونوں ایک جیسے ہیں
اک عجیب اُلجھن ہے کس کو گھر کہا جائے

دل کی روشنی کو لوگ، کیوں سحر نہیں کہتے
وقت کے اُجالے کو، کیوں سحر کہا جائے

گُمرہی کی منزل میں کس کو آج اے جوہر
راہزن کہا جائے، راہبر کہا جائے

بہ شکریہ دوردرشن کیندر لکھنؤ۔



بڑھ گئی اتنی تمازت آگہی کی دھوپ میں
زندگی خود جل رہی ہے زندگی کی دھوپ میں

گرمیِ صہبا سے اہلِ غم کو ملتا ہے سکوں
آئیے دو گھونٹ پی لیں مے کشی کی دھوپ میں

دھوپ پہلے بھی نکلتی تھی یہی موسم بھی تھا
اس قدر شدت کہاں تھی زندگی کی دھوپ میں

یہ لبِ جو، یہ فضائیں، یہ شمیمِ جانفزا
کیا حسیں لگتی ہیں راتیں، چاندنی کی دھوپ میں

کٹ ہی جائے گی کسی صورت حیاتِ مستعار
زندگی کی چھاؤں میں، یا زندگی کی دھوپ میں

کثرتِ انوار سے کچھ بھی نظر آتا نہیں
تیرگی ہی تیرگی ہے، روشنی کی دھوپ میں

کوئی شعلہ ہے نہ چنگاری، نہ سوزِ غم مگر
جس کو دیکھا جل رہا ہے زندگی کی دھوپ میں

پا برہنہ، بے ارادہ، ہم کہاں تک دوڑتے
جسم جل کر رہ گئے وارفتگی کی دھوپ میں

ایک دُنیا مضطرب ہے ایک عالم بے قرار
آج میخانے کے باہر تشنگی کی دھوپ میں

میں ہی اِک تنہا نہیں جو ہوں ہلاکِ زندگی
ساری دُنیا جل رہی ہے زندگی کی دھوپ میں



اِنقلاباتِ زمانہ کا اثر مانگے ہے
دلِ بیتاب کوئی تازہ خبر مانگے ہے

جُستجو چاہے ہے، ہر گام پہ اک منزلِ نو
زندگی حوصلۂ ذوقِ سفر مانگے ہے

آج کا دور خود انسان سے جینے کے لئے
قلب آہن کا تو پتّھر کا جگر مانگے ہے

یا وہ عالم تھا، کہ ہر راز سے دل واقف تھا
یا یہ صورت ہے، کہ خود اپنی خبر مانگے ہے

آج تعمیرِ نشیمن کو مرا عزمِ جواں
پھر وہی برق، وہی رقصِ شرر مانگے ہے

اُس کو جینے کے بھی آداب نہیں ہیں معلوم
غمِ دوراں سے جو گھبرا کے مَفر مانگے ہے

قابلِ رشک ہے اُس دل کی خودی اے جوھرؔ
شام مانگے ہے جو ظالم، نہ سحر مانگے ہے



اِک شخص، جو اُس بھیڑ میں حیران کھڑا ہے
ہر شے سے ہے واقف، مگر انجان کھڑا ہے

مِٹ جائیں گے تہذیب و تمدّن کے سب آثار
بارود کے انبار پہ انسان کھڑا ہے

ملتی ہی نہیں راہ، حوادث سے مَفر کی
جب دیکھیے سر پر کوئی طوفان کھڑا ہے

لرزاں نظر آتی ہے زمانے کی ہر اک شے
کیا جانے کہاں آج کا انسان کھڑا ہے

اِس دور میں ہر چیز ہے تسخیر کے قابل
کہتے ہو ہمالہ کو، نگہبان کھڑا ہے

جس شہر میں ہر سمت ہیں پتھر کی چٹانیں
شیشے کا اُسی شہر میں ایوان کھڑا ہے

اِک عہدِ بہاراں کی دلاتا ہے ہمیں یاد
وہ پیڑ، جو اُس باغ میں ویران کھڑا ہے

اک بھیڑ ہے لوگوں کی درِ یار پہ جو ہر
کیا کیا کوئی دل میں لئے ارمان کھڑا ہے



میں تیرگی سے گذرتا ہوں روشنی کی طرح
مجھے شعور ہے جینے کا آدمی کی طرح

یہی ادا تھی، یہی ناز تھا، یہی شوخی
اک اور شخص بھی دیکھا تھا آپ ہی کی طرح

میں اُن سے محوِ تکلّم، وہ مجھ سے گرمِ سخن
میں زندگی سے مخاطب ہوں زندگی کی طرح

خطا معاف، یہ ملنا بھی کوئی ملنا ہے
تم اپنے ہو کے بھی، ملتے ہو اجنبی کی طرح

ترا جمال ہے، آئینہ دارِ ذات و صفات
ترا خیال ہے، سورج کی روشنی کی طرح

کسی کی یاد کی خوشبو ہے مثلِ بوئے چمن
کسی کی زلف کا سایہ ہے چاندنی کی طرح

مری حیات، مری کائنات کے مالک
میں چاہتا ہوں، تجھے اپنی زندگی کی طرح

بدن مہک اٹھے خوشبوئے یار سے جوہرؔ
اگر حیات ہو پھولوں کی تازگی کی طرح

یہ غزل نغمۂ ناقوس یعنی تذکرۂ شعرائے ہنود ۱۹۰۱ء تا ۱۹۲۵ء میں شامل ہے جس کے مؤلف جناب بدھ پرکاش گپتا جوہر دیوبندی ڈی۔ لٹ ہیں۔ کتاب ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ جوہرؔ بجنوری



زندگی خواب بھی ہے، فتنۂ بیدار بھی ہے
نغمۂ امن بھی ہے، نعرۂ پیکار بھی ہے
شوقِ نظّارہ بھی ہے، جلوہ گہِ یار بھی ہے
دیکھنا ہے، کہ ہمیں جرأتِ دیدار بھی ہے
کون ہے، جس کو نہیں دعوئ عرفانِ خودی
اِس حقیقت سے مگر کوئی خبردار بھی ہے؟
انقلابات کا کیا غم کہ انہی کے دم سے
رونقِ بزم بھی ہے، گرمیِ بازار بھی ہے
کچھ تو خود حُسن کو ہے جلوہ نمائی سے گریز
اور کچھ مصلحتِ طالبِ دیدار بھی ہے

گرمیِ عشق میں دونوں ہیں برابر کے شریک
شمع کے سوز میں پروانے کا کردار بھی ہے

اپنے ماحول کی ناقدریِ پیہم کا شکار
آج کا فن ہی نہیں آج کا فنکار بھی ہے

زندگی عشرتِ پیہم ہی نہیں ہے جو ہمد
زندگی جہدِ مسلسل کی طلب گار بھی ہے



دریا کی حیثیت اُسے کیوں کر دکھائی دے
ایک ایک قطرہ جس کو سمندر دکھائی دے

یوں دل کی وادیوں سے گذرتی ہے اُس کی یاد
جیسے اُترتی دھوپ کا منظر دکھائی دے

اُس آئینے کو رکھئے بڑی احتیاط سے
جس آئینے میں حُسن کا پیکر دکھائی دے

بینائی بھی نصیب ہو اُس کو خُدا کرے
وہ آنکھ جس کو پھول بھی پتّھر دکھائی دے

دُنیا ہے بے قرار اُسی غم کے واسطے
وہ غم جو تیرے غم کے برابر دکھائی دے

ساقی کی چشمِ مست ہے گردش میں اِس طرح
صہبا دکھائی دے کبھی ساغر دکھائی دے

تسلیم مجھ کو وسعتِ کون و مکاں مگر
ہے کوئی شئے جو دل کے برابر دکھائی دے

یہ کیا مقامِ درد ہے جوھر کہ ہر نفس
ایک ایک لمحہ کرب کا خنجر دکھائی دے

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو، الہ آباد



جو تیری راہ، ترِی انجمن سے گذرے ہیں
وہ پہلے، منزلِ دار و رسن سے گذرے ہیں

روش روش پہ جل اُٹھے چراغِ لالہ و گُل
کچھ اِس ادا سے وہ صحنِ چمن سے گذرے ہیں

یہ بزمِ انجم و خورشید و ماہ کیا، ہم لوگ
ترِی تلاش میں ہر انجمن سے گذرے ہیں

دَماغ اُن کا مہکتا ہے بوئے گُل کی طرح
جو میرے گُلشنِ شعر و سخن سے گذرے ہیں

کوئی مقامِ طلب ہو، مگر یہ اہلِ جنوں
بڑے وقار، بڑے بانکپن سے گذرے ہیں

متاعِ جاں ہیں تری یاد کے حسیں جھونکے
جو روح بن کے فضائے چمن سے گذرے ہیں
انھیں سے پوچھئے جو ہر مقامِ خاکِ وطن
کبھی جو وادیِ گنگ و جمن سے گذرے ہیں



پھیلی ہوئی ہے آگ سی، منظر کے آس پاس
جلتا ہے گھر کسی کا، مرے گھر کے آس پاس

پھر دل پہ پھینک دے نہ کوئی بے رُخی کا سنگ
شیشے کا اِک مکان ہے پتّھر کے آس پاس

کچھ ایسے کم نصیب بھی ہیں اِس جہان میں
پیاسے کھڑے ہوئے ہیں سمندر کے آس پاس

قاتل کا دور تک تو نہ تھا کچھ پتہ مگر
چھینٹے پڑے تھے خون کے خنجر کے آس پاس

تا دیر سر جُھکائے کوئی سوچتا رہا
کیوں پھول رکھ گیا، کوئی پتّھر کے آس پاس

فیضانِ خضر بھی نہ اُسے راس آسکا
آبِ حیات گو تھا سکندر کے آس پاس

آنکھیں کھُلیں تو خُلد کا منظر تھا سامنے
رکھا تھا سر تو میں نے ترے در کے آس پاس

ہونے کو ہے ادب پہ کوئی آج تبصرہ
اہلِ سخن کی بھیڑ ہے جوہر کے آس پاس

○

بہارِ غنچہ و گُل ہے برائے نام ابھی
کہ انقلابِ گُلستاں ہے ناتمام ابھی

طلوعِ صبحِ بہاراں سہی مگر یہ کیا
فضا پہ چھائی ہے کچھ تیرگیِ شام ابھی

خلوصِ حُسنِ عمل ہے نہ اِعتمادِ خودی
ہوس بھی خام ابھی ہے طلب بھی خام ابھی

قدم قدم پہ ہے دعوائے رہبری اُن کو
چلے ہیں راہِ عمل میں جو چند گام ابھی

ابھی طلب کو نہیں کیفِ آگہی حاصِل
لیا نہیں ہے خرد نے جنوں سے کام ابھی

قدم قدم پہ جہاں، امتحانِ دل ہوگا
ملیں گے راہ میں، ایسے بھی کچھ مقام ابھی

بجا یہ خوبیِ طرزِ بیاں مگر واعظ
گراں ہے گوشِ جہاں پر ترا پیام ابھی

خود اپنی تشنگیِ شوق ہی ہے کم ورنہ
وہی ہے ساقیِ محفل، وہی ہے جام ابھی

کچھ اور فکر و نظر کو بلند کر جوہرؔ
کہ مہر و ماہ سے ہونا ہے ہمکلام ابھی



اب کہاں وہ دل کشی رعنائیوں کے شہر میں
زیست ہے ماتم کُناں، شہنائیوں کے شہر میں

زندگی کیا ہے فقط اک چلتی پھرتی دھوپ چھاؤں
ہم ہیں سائے کی طرح، پرچھائیوں کے شہر میں

ہے ہجومِ آرزو بھی، دل کی ویرانی کے ساتھ
اک عجب ہنگامہ ہے تنہائیوں کے شہر میں

ہر طرف وحشت کا عالم، ہر طرف فتنوں کا دَور
امن ہے نایاب شئے، بلوائیوں کے شہر میں

ہم بھی کتنے سخت دل ہیں، ہم بھی کتنے سخت جاں
جی رہے ہیں، معرکہ آرائیوں کے شہر میں

رفتہ رفتہ دل کی چوٹیں پھر ہری ہونے لگیں
زخم پھر رسنے لگے پروائیوں کے شہر میں

ہر طرف بکھری پڑی ہے دولتِ ایمان و دیں
آکے دیکھے تو کوئی سچّائیوں کے شہر میں

چل رہی ہے آج بھی انسانیت گھٹنوں کے بل
زندگی ہے اک گھُٹن پہنائیوں کے شہر میں

شوق اپنا لے چلا کوئے ملامت کی طرف
ہم بھی آخر آ گئے، رسوائیوں کے شہر میں

شہرِ سنگم[1] سے ہے جو گہرا ربطِ بے پایاں مجھے
عمر گذری ہے اسی رعنائیوں کے شہر میں

---

[1] الہ آباد



شعورِ غم کو جگا، اضطراب پیدا کر
نفس نفس میں نیا انقلاب پیدا کر

شعاعِ نور سے، ذرّوں کو دے کے تابانی
اِک آفتاب سے لاکھ آفتاب پیدا کر

نشاطِ غم سے، میسّر ہے زندگی کو فروغ
نمودِ غم سے غمِ بے حساب پیدا کر

ہے اضطراب میں مضمر تری حیات کا راز
سکوں کا نام نہ لے اضطراب پیدا کر

شکستِ جام پہ بُنیادِ عشق و مستی رکھ
شکستِ رنگ سے کیفِ شراب پیدا کر

جہانِ نَو کا تصوّر بجا سہی لیکن
جہانِ حُسن کا پہلے جواب پیدا کر
جو زندگی کو بنا دے اِک آئینہ جوہر
رُخِ حیات میں وہ آب و تاب پیدا کر



ہر طرف اک تیرگی ہے روشنی کے شہر میں
زندگی مفقود ہے خود زندگی کے شہر میں

دیکھئے اِس شہر کی قسمت کا کیا انجام ہو
عقل والوں کی کمی ہے آگہی کے شہر میں

یہ نمائش، یہ تصنّع، یہ ریا کاری کا دَور
کوئی بھی مفلس نہیں ہے مفلسی کے شہر میں

جب ہجومِ آگہی میں زیست گھبرانے لگی
جذبۂ دل لے چلا پھر بے خودی کے شہر میں

اب خدا جانے کہاں انسانیت گُم ہو گئی
آدمیّت کی کمی ہے آدمی کے شہر میں

کس کو زخمِ دل دکھاؤں، اب کسے آواز دوں
کوئی بھی اپنا نہیں ہے، بے کسی کے شہر میں

رہگذارِ عشق میں، دو گام ہے چلنا محال
موت بھی کترا رہی ہے زندگی کے شہر میں

آج ساقی کی طرف سے، باوجودِ اذنِ عام
تشنہ لب پھرتا ہے کوئی، مے کشی کے شہر میں

دن گذرتے جا رہے ہیں، کتنی بے کیفی کے ساتھ
لُطف جینے کا نہیں ہے بے حسی کے شہر میں

زندگی میں کاش، وہ دن بھی ہو اے جو ہر نصیب
زندگی جب لوٹ آئے زندگی کے شہر میں



روش روش پہ جہاں آج گُل کھلے ہیں بہت
اُسی چمن سے ہمیں زخم بھی ملے ہیں بہت

کسی کے حُسنِ تغافل کا کیا کریں شکوہ
ہمیں تو اپنی ہی تقدیر سے گلے ہیں بہت

جنوں بخیر ہمیں مشغلوں سے کب فرصت
اگر ہے عِشق سلامت تو سلسلے ہیں بہت

رہِ طلب کے مراحل ارے معاذاللہ
قدم قدم پہ یہاں راہزن ملے ہیں بہت

ہمیں پہ ختم ہیں سب مہربانیاں اُن کی
ہمیں پہ اُن کے مظالم کے سلسلے ہیں بہت

تمھارے غم کو نہ کیوں دل سے ہم دُعائیں دیں
کہ ایسے غم سے ہمیں حوصلے ملے ہیں بہت

چمن کو جن کی بہاروں پہ ناز ہے جوہرؔ
خزاں کے دور میں، ایسے بھی گُل کھلے ہیں بہت



روشنی بھی اب مجھ کو تیرگی سی لگتی ہے
وقت کے اُجالوں میں، کچھ کمی سی لگتی ہے

ریگزارِ ہستی میں، آندھیاں ہیں ہر جانب
دور تک فضاؤں میں گرد اُڑی سی لگتی ہے

عشق کی فضاؤں پر اک سکوت ہے طاری
حُسن کی اداؤں میں، برہمی سی لگتی ہے

آج پائے جاناں پر، مطمئن ہوں سر رکھ کر
آج زندگی اپنی زندگی سی لگتی ہے

عشق ہی نہیں تنہا، زخم دل سے افسردہ
حُسن کی بھی آنکھوں میں، کچھ نمی سی لگتی ہے

زندگی کا مدت سے، یوں تو ساتھ ہے جوہر
پھر بھی یہ نہ جانے کیوں، اجنبی سی لگتی ہے

ہزاروں آشیاں جل کر ہوئے خاک
گلستاں میں بہار آنے سے پہلے



نظر سے دور، خیال و گماں سے دور نہیں
کوئی جہاں، مری فکرِ جواں سے دور نہیں

غمِ حبیب کی وسعت میں، دو جہاں گُم ہیں
غمِ حبیب، غمِ دو جہاں سے دور نہیں

ہزار دور سہی منزلِ فنا لیکن
یہ جانتا ہوں کہ عمرِ رواں سے دور نہیں

تری تلاش سے پہلے یہ دیکھنا ہے ضرور
کہاں سے دور ہے تو، اور کہاں سے دور نہیں

مرا چمن ہے، مرے عالمِ تصوّر میں
قفس میں رہ کے بھی، ہیں آشیاں سے دور نہیں

جنھیں ہے شوقِ فغاں ان کو یہ نہیں معلوم
مقامِ ضبط، مقامِ فغاں سے دور نہیں
قدم قدم مرا منزل شناس ہے جوھر
کوئی مقام بھی عزمِ جواں سے دور نہیں



ایسا نہیں کہ ایک مرا گھر اُداس ہے
تیرے بغیر جو بھی ہے منظر اُداس ہے

کوئی اثر دکھا نہ سکا فن کا معجزہ
اپنے بتوں کو دیکھ کے آزر اُداس ہے

پہلوئے سنگ میں بھی ہے اک دردمند دل
وحشی کے سر کو پھوڑ کے پتّھر اداس ہے

جس نے کیا تھا قتل کسی بے گُناہ کا
اپنے کئے پہ اب وہی خنجر اُداس ہے

خاموش سطحِ آب ہے، مغموم ہے فضا
کشتی کو غرق کرکے، سمندر اُداس ہے

جس دل کے آئینے میں نہیں عکسِ روئے دوست
اُس دل کے آئینے کا مقدّر اُداس ہے

ساقی کی بے نیازیِ پیہم کو دیکھ کر
جوہرؔ حیاتِ عشق کا ساغر اُداس ہے



مری نظر میں ہے جب سے ترے شباب کا رنگ
اُڑا اُڑا نظر آتا ہے، ماہتاب کا رنگ

نقابِ حُسن پھر اُس پر ترے شباب کا رنگ
اک آفتاب کا پرتو اک آفتاب کا رنگ

کُھلی جب آنکھ تو پیشِ نگاہ کچھ بھی نہ تھا
بہت حسین تھا ورنہ خیال و خواب کا رنگ

شریکِ غم ہے، نہ کوئی انیسِ تنہائی
کسے دکھاؤں دلِ خانماں خراب کا رنگ

سوالِ شوق پہ تیرا تبسُّم بیہم
سمجھ رہا ہوں کہ ہے کیا ترے جواب کا رنگ

یہ خاص بات تھی ساقی کی چشمِ میگوں میں
نگاہ پڑتے ہی اُڑنے لگا شراب کا رنگ

ضیائے ماہ و کواکب، فروغِ لالہ و گُل
عیاں ہے سب سے تری ہستیِ شباب کا رنگ

نہ چھیڑ تذکرۂ انقلابِ نوائے دوست!
ابھی مٹا نہیں ماضی کے انقلاب کا رنگ

نہاں ہے موجۂ صہبا میں تیرا حُسنِ خرام
عیاں ہے شیشۂ مے سے ترے شباب کا رنگ

ہزار صاعقہ بردوش و جلوہ در آغوش
زہے فروغِ جوانی، خوشا نقاب کا رنگ

نیاز و ناز کا، کتنا حسیں مُرقع ہے
مرے سوال کا پہلو، ترے جواب کا رنگ

تمام بزمِ تصور پہ چھا گیا جوہر
خیالِ عارضِ رنگیں ہے یا گلاب کا رنگ



بزمِ طرب کو بھول جا، دار و رسن کی بات کر
رزم گہِ حیات میں تیغ و کفن کی بات کر

عہدِ بہار آگیا، رنگِ چمن کی بات کر
غنچہ و گُل کا ذکر چھیڑ، سرو سمن کی بات کر

کسبِ کمالِ فن سے ہے، ذوقِ نشاط کو فروغ
مقصدِ علم و فن سمجھ، عظمتِ فن کی بات کر

اپنے وطن کی برتری، اہلِ وطن کے دم سے ہے
چھوڑ تمام تذکرے، اہلِ وطن کی بات کر

جلوۂ آفتاب سے، نور ہے کائنات میں
ذرّوں کو روشنی جو دے، ایسی کرن کی بات کر

خاکِ وطن بھی ہمنشیں، لعل و گُہر سے کم نہیں
سارے جہاں کا ذکر کیا، گنگ و جمن کی بات کر

جوؔش و فراقؔ اور جگرؔ، صاحبِ فن سہی مگر
غالبؔ و داؔغ و میرؔ کے طرزِ سخن کی بات کر

پرچمِ نو بلند کر، نغمۂ انقلاب چھیڑ
معرکۂ حیات میں دار و رسن کی بات کر

جس نے جہانِ شعر کو ایک پیامِ نو دیا
جوؔھرِ خوش کلام کے رنگِ سخن کی بات کر



گُل و سمن نہیں گُلچیں، تو خار رہنے دے
چمن میں کچھ تو نشانِ بہار رہنے دے

تجھے جنوں کی قسم اے دلِ سکوں دُشمن
تمام عُمر مجھے بے قرار رہنے دے

کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ پھر سے جاگ اُٹھے
نوازشِ نگہِ فتنہ کار رہنے دے

فریبِ وعدۂ فردا بہت غنیمت ہے
مزاجِ دوست، اگر استوار رہنے دے

یہ حادثاتِ محبّت ہیں، آج بھی دل کش
اگر سکوں سے غمِ روزگار رہنے دے

نَفَس نَفَس ہے محبّت میں دائمی جوکھا
مگر جو زندگیٔ مُستعار رہنے دے

میں نے اِس دُنیا کو جب تک پاس سے دیکھا نہ تھا
کس قدر دل کش نظر آتی تھی یہ دُنیا مجھے



بازارِ محبّت میں یہ قیمتِ ہستی ہے
جتنی ہی یہ مہنگی ہے، اُتنی ہی یہ سستی ہے

کچھ دیر یہاں رُک کر پھر گرمِ سفر ہونا
دیوانو! ٹھہر جاؤ یہ پیار کی بستی ہے

ایسے بھی مسافر ہیں خود جن کے لئے صدیوں
راہیں بھی ترستی ہیں، منزل بھی ترستی ہے

کیوں بادہ و ساغر کا، احسان اُٹھائیں ہم
اُن آنکھوں کی مستی میں، نشّۂ جام کی مستی ہے

شادابیِ گلشن کی، اللہ رے سیہ بختی
اُٹھتی ہے گھٹا لیکن، کچھ دور برستی ہے

اک جام میں کھلتے ہیں اسرارِ حکیمانہ
آ تجھ کو بتاؤں میں، کیا بادہ پرستی ہے

یہ وحشتِ دل آخر، لائی ہے کہاں جوہر
کچھ راز نہیں کھلتا، صحرا ہے کہ بستی ہے

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو الہ آباد



آنسو مری پلکوں پر، مچلیں تو مچلنے دو
بُجھتے ہوئے شعلوں کو، کچھ دیر تو جلنے دو

آغوشِ حوادث میں، یارو مجھے پلنے دو
جس راہ میں کانٹے ہیں، اُس راہ پہ چلنے دو

جس رنگ میں چلتا ہے، دیوانے کو چلنے دو
بہکے تو بہکنے دو، سنبھلے تو سنبھلنے دو

جینے کے محبّت میں، انداز بدلنے دو
دامن کبھی بچانے دو، کانٹوں پہ کبھی چلنے دو

رفتارِ زمانہ کو، آواز میں ڈھلنے دو
صدیوں کی مسافت کو، لمحوں میں بدلنے دو

اُٹھیں گے قدم میرے خود جانبِ میخانہ
کچھ شام بھی ہونے دو، کچھ رات بھی ڈھلنے دو

پروانہ صفت بھی ہوں، جگنو سے بھی نسبت ہے
بُجھتا ہوں تو بُجھنے دو، جلتا ہوں تو جلنے دو

بھٹکے ہوئے راہی بھی، منزل پہ پہنچتے ہیں
جس راہ پہ چلتا ہوں اُس راہ پہ چلنے دو

ظلمات میں اُبھرے گی اک تازہ کرن جوہرؔ
احساس کے سانچے میں اشعار کو ڈھلنے دو

بہ شکریہ دور درشن کیندر لکھنؤ



وفا کی راہ میں سچ ہے کہ مرحلے ہیں بہت
مگر ہم اہلِ جنوں میں بھی حوصلے ہیں بہت

یہ دیکھنا ہے کہ منزل کسے میسّر ہو
رواں دواں تری جانب تو قافلے ہیں بہت

نہ جانے عشق کی منزل بھی کیسی منزل ہے
تمام عمر چلے پھر بھی فاصلے ہیں بہت

لہو بدن میں رواں ہے، تو ہر قدم پہ بہار
جواں ہیں حوصلے دل میں، تو ولولے ہیں بہت

کوئی بتائے کہ کس کس کا حل تلاش کریں
کہ عصرِ نو کے لئے آج مسئلے ہیں بہت

ازل کے روز ہی سے حُسن و عشق کے مابین
ہزار قُرب سہی پھر بھی فاصلے ہیں بہت
ہمارے دم سے سلامت ہے شوخی و مستی
وگرنہ شہر میں کہنے کو منچلے ہیں بہت
وہ کیا ملے کہ پھر اپنی بھی کچھ خبر نہ رہی
یہی ہے قُرب کا عالم تو فاصلے ہیں بہت
یہ کس مقام پہ لائی ہے گمرہی جوہرؔ
کہ منزلیں تو ہیں نزدیک فاصلے ہیں بہت

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو الٰہ آباد



وقت کی مصلحت سمجھ، وقت کا اعتبار کر
جس سے ملے حیاتِ نَو، راہ وہ اختیار کر

کشمکشِ جہاں سے دور، دسترسِ خزاں سے دور
ایک نیا چمن بنا، تکملۂ بہار کر

اے مرے ہمنشیں بتا، جو بھی ہو تیرا فیصلہ
یا مرے ساتھ ساتھ چل، یا مرا انتظار کر

عشق کی اصطلاح میں، زیست فنا کا نام ہے
زیست کا اعتبار کیا، موت کا اعتبار کر

یا تو بقدرِ تابِ غم، لذّتِ عشق دے مجھے
یا دلِ بے قرار کو، اور بھی بے قرار کر

آتے ہی لب پہ اُن کا نام مل گئی راحتِ دوام
کوئی خموش ہو گیا، آج اُنھیں پکار کر

اُس کی حریمِ ناز اگر تجھ کو کبھی نصیب ہو
دیدہ و دل کا ذکر کیا، جان کو بھی نثار کر

ایک ادائے خاص سے دل پہ گرا کے برقِ ناز
جو تھا ہی بے قرار کو، اور بھی بے قرار کر

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ



اِس دور میں جینے کے وہ حق دار نہیں ہیں
مرنے کے لئے جو ابھی تیار نہیں ہیں

اشعار ہیں جن کے نئے افکار نہیں ہیں
شاعر ہیں مگر آج کے فن کار نہیں ہیں

آدابِ غزل سے وہ خبردار نہیں ہیں
جو تیری اداؤں کے پرستار نہیں ہیں

کیا قحطِ محبت ہے کہ بازار جہاں میں
اک بھیڑ ہے ہر سمت خریدار نہیں ہیں

ہر دل میں ہے اک آتشِ خاموش فروزاں
یہ گھر کی تباہی کے تو آثار نہیں ہیں

ایسے بھی ہیں اِس دَورِ سیاسی میں کچھ افراد
کہنے کو تو بیدار ہیں، بیدار نہیں ہیں

قائم ہے یہاں گرمیِ بازار ہمیں سے
ہم رونقِ بازار ہیں ، بازار نہیں ہیں

غزلوں کو نئے روپ میں ڈھالا ہے ہمیں نے
شاعر ہیں روایت کے پرستار نہیں ہیں

کیا لُطف میسر ہو انھیں زیست کا جوہر
جو تازہ حوادث میں گرفتار نہیں ہیں



تو نے کل دیکھا تھا جو منظر، وہ منظر بھول جا
کس کا ڈوبا تھا سفینہ، اور کیونکر بھول جا

بُت تراشوں کی نہیں اِس دور میں کوئی کمی
آج پیدا ہو گئے ہیں کتنے آزر، بھول جا

زندگی کی تلخیوں سے بے نیازانہ گذر
تلخیوں کو خوبصورت موڑ دے کر بھول جا

چوٹ وہ دل پر لگے یا ضرب آئے جسم پر
وہ زباں کا زخم ہو یا کوئی پتّھر بھول جا

زندگانی کے تلاطم میں نہ کر ساحل تلاش
سامنے کیا چیز ہے تیرے سمندر، بھول جا

تو اگر انسان ہے، انسان کی عظمت سمجھ
کون برتر ہے یہاں اور کون کمتر بھول جا

چارہ گر کی جُستجو اس دور میں بے سُود ہے
زخمِ دل اپنا، زمانے کو دکھا کر بھول جا

نا اُمیدی چھوڑ دے جوشِ عمل سے کام لے
ہے مقدّر لفظ بے معنیٰ، مقدّر بھول جا

تلخیِ عہدِ گذشتہ کو نہ ہرگز یاد رکھ
مصلحت ہے بھول ہی جانے میں جوؔہر بھول جا

میرا حالِ دل مرے رُخ سے عیاں ہونے کو ہے
اب حدیثِ من حدیثِ دیگراں ہونے کو ہے



چہرے سے نمایاں ہے، ایک ایک ادا غم کی
انساں جسے کہتے ہیں تصویر ہے ماتم کی

کیوں ہم کو ڈراتے ہو، آشوبِ جہنّم سے
دُنیا بھی تو آخر ہے، اک شکل جہنّم کی

مجبوری و معذوری، محرومی و ناکامی
آخر کوئی حد بھی ہے اِس سلسلۂ غم کی

ہر آن مقابل ہے یہ مہرِ درخشاں کے
جرأت تو کوئی دیکھے اک قطرۂ شبنم کی

جنّت سے نکل کر پھر جنّت نہ ملی اِس کو
کیا کیا ابھی لکّھا ہے تقدیر میں آدم کی

درکار ہے گیتی کو پھر تازہ لہو شاید
سُرخی یہی کہتی ہے افسانۂ عالم کی

گرداب میں اے جوہر یہ کس کا سفینہ ہے
موجوں کے تلاطُم میں آواز ہے ماتم کی

اِک عمر میں ہوا ہوں شائستۂ اسیری
صیّاد اب قفس سے مجھ کو رہا نہ کرنا



آدمی کدھر جائے بے بسی نے گھیرا ہے

قاتلوں کی بستی میں زندگی کا ڈیرا ہے

چاندنی کے سائے میں رات کا بسیرا ہے

کیا حسیں اُجالا ہے، کیا حسیں اندھیرا ہے

وقت ایک رہبر بھی، وقت ایک رہزن بھی

وقت ہی نگہباں ہے، وقت ہی لُٹیرا ہے

اس نئے اُجالے سے تیرگی ہی بہتر تھی

روشنی کے دیوانو! کیا یہی سویرا ہے

جیسے آج گُلشن میں ہر طرف چراغاں ہو

یوں مرے نشیمن کو بجلیوں نے گھیرا ہے

تو نہ بن سکا میرا، میں نہ ہو سکا تیرا
وہ قصور تیرا تھا، یہ قصور میرا ہے

تیرے غم کی چھاؤں میں، اک سکون ملتا ہے
تیری یاد کا سایہ، کس قدر گھنیرا ہے

سوچتا ہوں رہ رہ کر کیا جواب دوں جوہرؔ
کچھ نئے سوالوں نے، آج مجھ کو گھیرا ہے



چمن اخلاص و محبت کے کھلا دو یارو
دل کے ہر زخم کو اک پھول بنا دو یارو

مُسکراتے ہوئے زہرابِ صداقت پی جاؤ
بات جو حق ہو سرِ دار سُنا دو یارو

نارِ نمرود جو یہ شُعلہ فشاں ہے ہر سو
آؤ اِس آگ کو گُلزار بنا دو یارو

عشق بے خوف و خطر دار پہ چڑھ جاتا ہے
عشق کی شان، زمانے کو دکھا دو یارو

زندگی سرد ہوئی جاتی ہے شبنم کی طرح
زندگی کو ہمہ تن شُعلہ بنا دو یارو

جس سے تعمیرِ نشیمن میں خلل پڑتا ہو
ایسی ہر شاخ کو گُلشن میں جلادو یارو

زندگی، ذوقِ عمل، حُسنِ عمل، روحِ عمل
زندگی کے لئے کچھ کر کے دکھادو یارو

میرے پیغام میں پوشیدہ ہے تلقینِ عمل
میرا پیغام زمانے کو سُنادو یارو

مجھ کو اِس دورِ ہوس میں ہے محبّت کی تلاش
میری راہوں میں کوئی شمع جلادو یارو

جو سمجھتے ہیں کہ محدود ہے دامانِ غزل
یہ مِری تازہ غزل اُن کو سُنادو یارو

میں ہوں اک جوہرِ نایابِ محبّت بخدا
اب بھی پہچانو مجھے اور دُعادو یارو



محبّت میں خِرد کی این و آں کیا
یہاں گنجائشِ لفظ و بیاں کیا

رہے گی آنکھ کب تک محوِ حیرت
نہ اُٹھّے گا حجابِ درمیاں کیا

جبینِ شوق پر نازاں ہوں سجدے
جبینِ شوق، ننگِ آستاں کیا

محبت جستجو ہی جُستجو ہے
محبّت میں تلاشِ کارواں کیا

گُماں بھی ہے یقیں کی ایک منزل
یقیں جس پر نہ آئے وہ گُماں کیا

خِرد کی منزلِ خوش آگہی کا
جنوں سے بڑھ کے کوئی رازداں کیا

خموشی سو زبانوں کی زباں ہے
طریقِ عشق میں آہ و فغاں کیا

چمن ہی سے وجودِ آشیاں ہے
چمن ہی جب نہیں تو آشیاں کیا

جسے فکرِ نشیمن ہو نہ جوہرؔ
اُسے اندیشۂ برقِ تپاں کیا



یہ بجا، کہ بجلیوں کا مجھے کوئی ڈر نہیں ہے
مگر آشیاں چمن میں، ابھی بے خطر نہیں ہے
جسے آفتابِ نو سے، نہ ملی ہو اِک کرن بھی
اُسے کیوں سحر کہیں ہم، وہ سحر، سحر نہیں ہے
غمِ جستجو کے صدقے، میں اب اُس مقام پر ہوں
کہ بجز خیالِ جاناں، کوئی ہمسفر نہیں ہے
وہ چمک رہا ہے سر پر، نئی زندگی کا سورج
ہیں غضب کے سونے والے، انھیں کچھ خبر نہیں ہے
چلیں ایسی کچھ ہوائیں، کہ بدل گئیں فضائیں
جو بچا ہو آندھیوں سے، کوئی ایسا گھر نہیں ہے

گرے لاکھ بار بجلی، مرے آشیاں پہ لیکن
مجھے غم ہے گلستاں کا، غمِ بال و پر نہیں ہے

مرے پانو کیوں نہ ٹھہریں، تری رہگذر میں آکر
تری رہگذر سے آگے، کوئی رہگذر نہیں ہے

جسے دیکھئے جہاں میں، وہ ہے چارہ ساز لیکن
مرے زخمِ دل کا جوہر، کوئی چارہ گر نہیں ہے



مِرا غم تھا نامکمّل، غمِ ناگہاں سے پہلے
مِری زندگی تھی مبہم، ترے امتحاں سے پہلے

یہی اصلِ عاشقی ہے، یہی رازِ زندگی ہے
غمِ دوست چاہتا ہوں، غمِ دو جہاں سے پہلے

ترا حُسن ہے عبارت، مِرے عِشق کی بدولت
تری داستاں کہاں تھی، مری داستاں سے پہلے

بہ ہزار سختیِ غم، سرِ منزلِ محبّت
کوئی کارواں نہ پہنچا، مرے کارواں سے پہلے

ترے عشقِ بے اماں نے، مجھے دی نہ اِتنی مہلت
کوئی مشورہ ہی کرتا، کسی مہرباں سے پہلے

غمِ زندگی مقدّم، غمِ این و آں موخّر
کہ غمِ چمن غلط ہے، غمِ آشیاں سے پہلے

یہ جنوں کی سخت منزل، کہ جہاں پہنچ کے جو ہر
کئی کارواں ہوئے گُم مرے کارواں سے پہلے

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو جے پور



اِس دَور میں ہر لحظہ، اک تازہ مصیبت ہے
جینا بھی قیامت ہے، مرنا بھی قیامت ہے
یہ دورِ سیاست بھی، کیا دورِ سیاست ہے
مذہب کی نمائش ہے، ایماں کی تجارت ہے
شعلوں میں بسر کرنا، دشوار سہی لیکن
تعمیرِ نشیمن کو، بجلی کی ضرورت ہے
انسان کو لازم ہے، لے کام محبّت سے
دُنیا میں محبّت کی، ہر دل پہ حکومت ہے
ہے جُرمِ محبّت میں، دل کی بھی خطا، لیکن
اُن کی بھی نگاہوں کی، معصوم شرارت ہے

ہر راہِ صداقت میں، ہر راہِ محبّت میں
جینے کی بھی خواہش ہے، مرنے کی بھی حسرت ہے

آشوبِ زمانہ کا، کچھ خوف نہیں مجھ کو
طوفان سے ٹکرانا جوہر مری فطرت ہے



آدمیّت کی کمی، آج جس انسان میں ہے
وہ نہ ہندو میں ہے شامل، نہ مسلمان میں ہے

زندگانی کا اُمنڈتا ہوا یہ سیلِ رواں
جو سفینہ ہے تلاطم میں ہے، طوفان میں ہے

اس زمانے کے، مسائل کا سُلجھنا معلوم
زیست اُلجھی ہوئی، خود اپنے گریبان میں ہے

امن و تہذیب پہ ہے، موت کا عالم طاری
دیکھئے جس کو وہی، جنگ کے میدان میں ہے

حرم و دیر کی تصویرِ مجسّم ہوں میں
کُفر کا رنگ بھی، شامل مرے ایمان میں ہے

اُس حقیقت کا نہیں سارے زمانے میں جواب
جو حقیقت مرے افسانے کے عنوان میں ہے

جو بھی پڑھتا ہے، وہی دادِ سخن دیتا ہے
کوئی تاثیر تو جوہر ترے دیوان میں ہے



کیسا قُرب، کہاں کی دوری
عشق میں دونوں غیر ضروری
دل کو نہیں جب تابِ حضوری
جیسی قربت، ویسی دوری
پوچھ نہ کچھ ہنگامِ حضوری
اہلِ محبّت کی مجبوری
اللہ اللہ، شانِ حضوری
دل سے قُربت، آنکھ سے دوری
تیرے بغیر اے جانِ تغافُل
دل کی ہر دھڑکن ہے ادھوری

اُن کی طلب سے، پہلے اے دل
سیکھ لے کچھ، آدابِ حضوری

تجھ کو بُھلا کر اب میں سمجھا
یاد تھی تیری، کتنی ضروری

اُن کی جفائیں، غیر اِرادی
اپنی وفائیں، غیر شعوری

ایسی طلب، توہینِ طلب ہے
عشق میں جو، ہو جائے پوری

ربطِ محبّت، اپنی جگہ ہے
لاکھ سہی، نظروں سے دوری

دل کے بدلے، درد ملا ہے
مل گئی قیمت، پوری پوری

جلوہ! جلوہ، پردہ! پردہ
قربت! قربت، دوری! دوری

اُف وہ دلِ دیوانہ جو ہر
راس نہ آئی جس کو حضوری



زباں کا عشق میں کیا کام گفتگو کے لئے
نگاہ کم نہیں اظہارِ آرزو کے لئے

کسی طلب کے لئے ہے، نہ آرزو کے لئے
حیات رقص میں ہے، تیری جُستجو کے لئے

وہ پھول، ننگ ہے، دُنیائے رنگ و بو کے لئے
نہ آئے کام، جو گُلشن کی آبرو کے لئے

جہانِ عقل سے گُذرا، تو یہ ہوا معلوم
مقام اور بھی ہیں، تیری جُستجو کے لئے

چمن میں پھول تو، کھِلنے کو کھِل گئے لیکن
ابھی لہو کی ضرورت ہے رنگ و بو کے لئے

چمن کی سیر مبارک تجھے، مگر ہمدم
"سلیقہ چاہیئے پھولوں سے گفتگو کے لئے"

عجب طرح کی کشاکش ہے بزمِ رنداں میں
شراب و شیشہ و پیمانہ و سبو کے لئے

ہے جشنِ کوچۂ قاتل، تو جشنِ دار کہیں
یہ اہتمام ہیں کیا کیا، مِرے لہو کے لئے

بڑے شعور، بڑے اہتمام سے جوکھ
غزل کہی ہے، تغزّل کی آبرو کے لئے

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو الہ آباد



تجھے ناصحا مبارک، تری آگہی کی باتیں
تری آگہی سے بڑھ کر، مری گمرہی کی باتیں

ترا التفاتِ پیہم، مرے زخمِ دل کا مرہم
مری زندگی کا حاصل تری بےرُخی کی باتیں

یہ عجیب ماجرا ہے، کہ مجھے عزیز تر ہیں
تری دوستی سے بڑھ کر، تری برہمی کی باتیں

اسی کشمکش میں آخر، مری عمر کٹ گئی ہے
کبھی موت کا تصوّر، کبھی زندگی کی باتیں

ترا بننا اور سنورنا، تجھے سر بسر مبارک
مجھے ہیں عزیز لیکن، تری سادگی کی باتیں

مری خامشی میں پنہاں، مری گفتگو کا مقصد
مری گفتگو کا مقصد، مری خامُشی کی باتیں

کبھی ہاتھ جام پر ہے، کبھی اس کا مجھ کو ڈر ہے
کہیں عام ہو نہ جائیں، مری مے کشی کی باتیں

کہیں زندگی کا ماتم، کہیں عشرتوں کی محفل
کہیں ذکر تیرگی کا، کہیں روشنی کی باتیں

مرے قول اور عمل میں، نہیں کوئی فرق جوہرؔ
مری شاعری میں پنہاں، مری زندگی کی باتیں



جو تعلق ہے، جنوں کو رسن و دار کے ساتھ
وہی نسبت ہے، مرے دل کو غمِ یار کے ساتھ

عقل ہوتی ہے جہاں عظمتِ کردار کے ساتھ
جاگ اُٹھتا ہے جنوں، نغمۂ بیدار کے ساتھ

صرف آواز سے نغمہ کہیں پاتا ہے فروغ
سوز بھی چاہیئے کچھ ساز کی جھنکار کے ساتھ

شرط ہے، ذوقِ عمل مرحلۂ ہستی میں
زندگی آپ بدل جاتی ہے، کردار کے ساتھ

نکہتِ لالۂ و گُل سے ہے، گُلستاں کا وقار
عظمتِ فن ہے فقط، عظمتِ فنکار کے ساتھ

وقت جادہ بھی ہے، منزل بھی ہے، رہبر بھی ہے
چل کے دیکھے تو کوئی، وقت کی رفتار کے ساتھ

وہ قدم رکھے، تری بزمِ تمنّا میں جسے
جرأتِ شوق بھی ہو، جرأتِ گفتار کے ساتھ

زندگی موج و تلاطُم میں گذر جاتی ہے
کھیلتا ہوں کبھی طوفاں کبھی منجدھار کے ساتھ

دامنِ ہوش، نہ چھُٹ جائے کہیں اے جوہر
چھیڑ اچھّی نہیں اتنی نگہِ یار کے ساتھ



مجھے اے غمِ محبّت، یہ کرم نہیں گوارا
کبھی موت کی کشاکش، کبھی زیست کا سہارا

ملے جو مقام جس کو، یہ نصیب اپنا اپنا
اُسی بحر میں تلاطم، اُسی بحر میں کنارہ

مجھے ڈر ہے، چھِن نہ جائے مری بیکسی کی عظمت
کہیں آپ کا تصوّر، مجھے دے نہ دے سہارا

تری بے نیازیوں سے، جو اُمید ہو تو کیا ہو
نہ کرم ہی آشکارا، نہ ستم ہی آشکارا

مرا دل دُکھانے والے، نہ ہو تو ستم پہ نازاں
تجھے درد اِک تماشا، مجھے درد اِک سہارا

مرے دل کے آئینے کو، ترے حُسن نے جِلا دی
مرے ذوقِ شاعری کو، ترے عشق نے سنوارا

یہ تموّجِ حوادث، یہ تلاطُمِ محبت
نہ اِدھر کہیں کنارہ نہ اُدھر کہیں کنارہ

جسے آنکھ نے گرایا، وہ حقیر اشک ہوں میں
جسے آسماں نے پھینکا، وہ بُجھا ہوا ستارہ

مری زندگی ہے جوہر، ہمہ رنگ و نور و نکہت
کبھی پھول بن گیا میں، کبھی بن گیا شرارہ

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ الہ آباد



مری وفا، مرے دیوانہ پن کی بات آئی
جہاں کبھی عظمتِ دار و رسن کی بات آئی

چمن میں جب کبھی سرو سمن کی بات آئی
ترے شباب، ترے بانکپن کی بات آئی

کہاں کہاں، نہ چھڑا قصۂ حیات و مرگ
کہاں کہاں، نہ تری انجمن کی بات آئی

حیاتِ عشق نئے مرحلوں میں جب اُلجھی
کسی کی زُلفِ شکن در شکن کی بات آئی

وہ بزمِ ماہ وشاں ہو کہ بزمِ نکہت و رنگ
ہر انجمن میں، تری انجمن کی بات آئی

قفس میں جب بھی نشیمن کا تذکرہ آیا
ستم ظریفیِ اہلِ چمن کی بات آئی

جہاں جہاں بھی ہوا، کوئی تبصرہ فن پر
وہاں وہاں، مرے طرزِ سخن کی بات آئی

میں اِک مسافرِ راہِ جنوں ہوں اے جوہر
کبھی نہ میری زباں پر تھکن کی بات آئی



غم کی آغوش میں جو پلتے ہیں
وہی دُنیا کا رُخ بدلتے ہیں

خار تو کیا ہیں، ہم گلوں سے بھی
اپنا دامن بچا کے چلتے ہیں

اِنہی خاموش سی فضاؤں میں
کتنے طوفان ہیں جو پلتے ہیں

لاکھ کانٹے بچھے ہوں راہوں میں
چلنے والے ضرور چلتے ہیں

منزلیں چومتی ہیں اُن کے قدم
آپ جو اپنی راہ چلتے ہیں

ہیں وہی اصل میں زمانہ شناس
جو زمانے کے ساتھ چلتے ہیں

اُن کو ملتی ہے زندگیِ دوام
ٹھوکریں کھا کے جو سنبھلتے ہیں

شعبدے دیکھ چشمِ ساقی کے
مے چھلکتی ہے جام چلتے ہیں

خوف سے رہزنوں کے اے جوؔہر
ہم کہیں راستہ بدلتے ہیں



مٹ جائیں تیرے دَور میں، ایسے تو ہم نہیں
اے انقلاب تجھ میں ابھی اتنا دم نہیں

ہوں وہ چمن پرست کہ میری نگاہ میں
دورِ خزاں بھی، عہدِ بہاراں سے کم نہیں

ہو عیشِ دوجہاں بھی میسّر اُسے تو کیا
جس کو نصیب تیری محبّت کا غم نہیں

دُنیا ہزار، سرکش و مغرور ہو مگر
کس کا سرِ نیاز، تیرے در پہ خم نہیں

دیوانہ کہہ گئے وہ سرِ انجمن مجھے
یہ مرتبہ بھی، اہلِ محبّت کا کم نہیں

کتنا ہی تم مٹاؤ، اُبھرتا ہی جائے گا
یہ میرا دل ہے، غیر کا نقشِ قدم نہیں

وہ قلب کیا، جو تیرے لئے ہو نہ بے قرار
وہ آنکھ کیا جو تیری محبّت میں نم نہیں

ہر زخمِ دل ہے رنگِ گُلِ تر لئے ہوئے
جوتھا مجھے بہارِ گذشتہ کا غم نہیں



جہاں بھی، پستیِ کردار دیکھی
وہیں منزل بہت دشوار دیکھی

خرد نے، جب بھی اپنا سر اُٹھایا
جنوں کے، ہاتھ میں تلوار دیکھی

بہت نازک ہے، شاید فطرتِ عشق
طبیعت پر، خوشی بھی بار دیکھی

تکلّم برطرف، اُس انجمن میں
خموشی، حاصلِ گفتار دیکھی

مسرت بھی، نہ دل کو راس آئی
طبیعت، غم سے جب بیزار دیکھی

خوشا، وہ آئینہ جس آئینے میں
تجلّیِ جمالِ یار دیکھی
نظر آئے جہاں بھی لالۂ و گُل
چمن میں وہ زمیں پُر خار دیکھی

نگاہوں سے وہی پنہاں ہے جوہر
حقیقت جس کی لاکھوں بار دیکھی



کشتی کی ضرورت کیوں، ساحل کی تمنّا کیا
ہم جیسے مسافر کو، منزل کی تمنّا کیا

اک غم کے تصوّر سے، ہستی کا تصوّر ہے
غم جس میں نہیں شامل، اُس دل کی تمنّا کیا

آغوشِ تلاطُم میں، اک لُطف ہے جینے کا
پروردۂ طوفاں کو، ساحل کی تمنّا کیا

جُز شوقِ سفر اپنا، مقصود نہیں کچھ بھی
آوارۂ منزل ہوں، منزل کی تمنّا کیا

جس دَور کا ہر لمحہ اِک خنجرِ قاتل ہو
اُس دَور کے بسمل کو قاتِل کی تمنّا کیا

اِس عالمِ ہستی میں، ہے عزمِ عمل لازم
حاصل تو یقینی ہے، حاصل کی تمنّا کیا

جو اپنی جگہ خود ہی اک صاحبِ محفل ہو
جوہر اُسے غیروں کی محفل کی تمنّا کیا

انسانیت کو حاصلِ ایماں بنائیے
مستقبلِ جہاں کو، درخشاں بنائیے

ہر گام پر کھلائیے، مہر و وفا کے پھول
ویرانۂ جہاں کو، گلستاں بنائیے

قطرے کو پہلے موج میں تبدیل کیجیے
پھر بن سکے تو موج کو طوفاں بنائیے

پنہاں ہے حادثات میں اِک تازہ زندگی
دل کو حریفِ گردشِ دوراں بنائیے

پابندیوں سے لیجیے اک درسِ انقلاب
کُنجِ قفس کو صحنِ گلستاں بنائیے

جب زخمِ دل کو، راس نہ آئے کوئی عِلاج
خود درد ہی کو، درد کا درماں بنائیے

ساحل تو مل ہی جائے گا، ساحل کی فکر کیا
کشتی کا پہلے، کوئی نگہباں بنائیے

کچھ اِس ادا سے، چھیڑیئے تارِ رگِ حیات
اِک اِک نفَس کو، سازِ غزل خواں بنائیے

جو ہر مقامِ دل سے، گذریئے کچھ اس طرح
اِک اِک قدم کو، منزلِ جاناں بنائیے

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ۔

O

اے کاش، کوئی ایسی بھی اک شمع جلادے
اس دور کی، جو تیرہ فضائی کو مٹادے

یہ راز بھی، ساحل کے تماشائی سمجھ لیں
وہ چاہے، تو ساحل سے بھی طوفان اُٹھادے

اِس دور میں، جینے کا سلیقہ ہے اُسی کو
جو وقت کی آواز میں آواز ملادے

اللہ، ہمیں ایسی ترقّی سے بچائے
دُنیا سے جو تہذیب کے آثار مٹادے

تسخیرِ مہ و مہر میں انسان ہے مصروف
دیکھے کوئی اِس خاک کے پُتلے کے ارادے

دُنیا کو ضرورت ہے اب اُس درس کی جو ہر
جو آج کے انسان کو، انسان بنا دے

اے برق! نشیمن تو مرا پھونک دے لیکن
گُلشن کی تباہی، مجھے منظور نہیں ہے



چمن میں چہرۂ گل پر کہاں نکھار کا رنگ
نہ جانے کیسا ہے، اب کے برس بہار کا رنگ
وہ اضطراب کا عالم، وہ انتشار کا رنگ
خوشا وہ دل، جسے راس آئے انتظار کا رنگ
چمن کو جس نے خود اپنے لہو سے سینچا ہے
اُسی سے پوچھئے رعنائیِ بہار کا رنگ
ہر ایک رنگ، یہاں جنّتِ نگاہ سہی
مگر عزیز ہے، مجھ کو خیالِ یار کا رنگ
ہمارے دم سے ہے، قائم چمن کی رعنائی
ہمارے خون سے ملتا ہے، لالہ زار کا رنگ

نہ پوچھ، کیسے شبِ انتظار گذری ہے
یہ دیکھ، کیا ہے مری چشمِ انتظار کا رنگ

ہزار وعدۂ محکم کے باوجود اے دوست!
مٹا مٹا سا ہے، پھر تیرے اعتبار کا رنگ

وفا کا خون، کبھی رائگاں نہیں جاتا
ہے سُرخ آج بھی جوہرِ صلیب و دار کا رنگ



غزل کے ساز پہ، رکھ دیں جب انگلیاں میں نے
بکھیر دیں، غمِ دوراں کی دھجیاں میں نے
بس ایک برق سی چمکی تھی، یاد ہے اتنا
چمن میں پھر کہیں دیکھا نہ آشیاں میں نے
یہ اور بات ہے، تجھ کو نہ پا سکا لیکن
ترے خیال کی چھو لیں، بلندیاں میں نے
چمن کی یاد میں اپنے لہو کی چھینٹوں سے
بنا لیا ہے قفس کو بھی، گلستاں میں نے
کہیں حرم کی، کہیں دیر کی پڑی بنیاد
جھکا دیا، سرِ تسلیم کو جہاں میں نے

چمن میں جشنِ چراغاں کا اہتمام کیا
سجا کے شاخِ نشیمن پہ بجلیاں میں نے

اُتر گیا مری نظروں سے رنگِ لالۂ و گُل
چمن میں دیکھی جو آتی ہوئی خزاں میں نے

سَراب و دشت میں گُمراہ قافلوں کے لئے
ہر ایک گام پہ چھوڑا ہے اک نشاں میں نے

یہ بات اور کہ منزل نہ مل سکی جو مگر
لیا نہیں کبھی، احسانِ کارواں میں نے



یہ آسماں پہ جو تارا دکھائی دیتا ہے
شبِ الم کا سہارا دکھائی دیتا ہے

بڑھو تو، مل نہ سکے بحرِ عشق کا ساحل
رُکو تو، پاس کنارا دکھائی دیتا ہے

یہ شخص، جس کے تبسّم میں زخم پنہاں ہیں
غمِ حیات کا مارا دکھائی دیتا ہے

مرا ہی ہاتھ نہیں ہے مری تباہی میں
ترا بھی اس میں اشارا دکھائی دیتا ہے

کہاں تھی پہلے گلستاں میں ایسی رنگینی
لہو کچھ اس میں ہمارا دکھائی دیتا ہے

یہ سر جُھکائے جو بیٹھا ہے تیری محفل میں
ترے خُلوص کا مارا، دکھائی دیتا ہے

جو تم دکھا نہ سکے، دل کے زخم اے جوہر
قصور اِس میں تمھارا، دکھائی دیتا ہے



رسن و دار سے، یا کوئے بُتاں سے اُٹھے
فتنہ ہر حال میں فتنہ ہے، جہاں سے اُٹھے

کتنے جاں سوز و دلآویز ہیں وہ نغمے بھی
شعلہ بن کر، جو مرے حُسنِ بیاں سے اُٹھے

دونوں عالم میں کہیں اُن کو ٹھکانا نہ ملا
جو تری بزم سے اُٹھے، وہ جہاں سے اُٹھے

ہائے وہ نالے کہ جو عرشِ بریں تک پہنچے
اُف وہ طوفاں، جو مرے اشکِ رواں سے اُٹھے

کششِ حُسن نے اک گام بھی چلنے نہ دیا
پھر وہیں بیٹھ گئے لوگ، جہاں سے اُٹھے

کام کچھ کر نہ سکا، واعظِ ناداں کا طلسم
کتنے طوفاں مری خاموش فغاں سے اُٹھے

اُن حجابات کی عظمت کو کہوں کیا جو ھر
جو یقیں بن کے مرے وہم و گماں سے اُٹھے



رُخ بدلنے کو ہے، کیا عالمِ امکاں کوئی
بر بطِ دار پہ ہے، آج غزل خواں کوئی

ٹھہری ٹھہری سی یہ موجیں، یہ سکوتِ دریا
کیا اُبھرنے کو ہے، پھر شورشِ طوفاں کوئی

کھینچ کر چشمِ تصوّر ہی میں، تصویرِ بہار
کیوں قفس ہی میں، بنالوں نہ گُلستاں کوئی

جو ہیں آزاد، قفس میں بھی رہیں گے آزاد
روک سکتی نہیں، پابندیِ زنداں کوئی

یہ ندا آئی، طوافِ حرم و دیر کے بعد
دل سے بڑھ کر ہے کہاں صاحبِ ایماں کوئی

کام آ ہی گئی جو ش مری شوریدہ سری
اب مجھے دیکھ کے ہے سر بہ گریباں کوئی



تیرے غم سے بھی، علاجِ غمِ دوراں نہ ہوا
تیری زلفوں کی طرح سب کو پریشاں دیکھا



بہارِ شام، نہ رنگینیِ سحر سے مجھے
نشاطِ دل ہے میسّر، تری نظر سے مجھے

کہاں یہ گوشۂ زنداں، کہاں فضائے چمن
گلہ رہے گا، ہمیشہ یہ بال و پر سے مجھے

شعورِ عشق، شعورِ وفا، شعورِ حیات
ملی ہیں نعمتیں کیا کیا تری نظر سے مجھے

قدم قدم پہ، جبینِ نیاز جھکتی ہے
ہے ایک ربطِ نہاں، تیری رہگذر سے مجھے

ابھی اجل کو، پیامِ حیات دینا ہے
ابھی ہیں کام بہت، عمرِ مختصر سے مجھے

گذر گئے ہیں وہ جس راہ سے کبھی اک بار
ہزار بار گذرنا پڑا اُدھر سے مجھے

جنوں سے بڑھ کے نہیں کوئی رہنما جو بھی
ملا ہے درس، یہ اک صاحبِ نظر سے مجھے



رنگِ بہار و نکہتِ گُل ہائے تر لئے

موجِ نسیم آئی، پیامِ سحر لئے

ہر انقلابِ دہر سے تازہ اثر لئے

دُنیا سے بے خبر ہوں، دلِ باخبر لئے

پیہم نوازشِ غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ

بارِ غمِ حیات بھی ہوں، دوش پر لئے

شائستۂ جنونِ محبّت ہے کس قدر

پروانہ، سوزِ زندگیٔ مختصر لئے

یوں آج کوئی سامنے آکر گذر گیا

ناکامِ دید رہ گئے تابِ نظر لئے

اک اک قدم پہ، منزلِ مقصود بن گئی
گذرا ہوں، جس مقام سے عزمِ سفر لئے

وسعت کو تیری دیکھ کر اے رحمتِ تمام
دانستہ جو گُناہ، نہ کرنے تھے کر لئے

ہم وہ اسیر تھے کہ رہائی کے بعد بھی
بیٹھے رہے قفس میں، غمِ بال و پر لئے

پُرسش نہیں وطن میں، جب اہلِ کمال کی
جوہر کہاں میں جاؤں، متاعِ ہُنر لئے



بہارِ بزم، کہاں لُٹ گئی خُدا جانے
سحر ہوئی تو نہ پھر شمع تھی نہ پروانے

وہ شوق کیا، کہ جو شرح و بیاں کا ہو محتاج
وہ عشق کیا، جسے تیری نظر نہ پہچانے

اگر سُنے تو اجل کا بھی رُخ بدل جائے
ابھی حیات نے چھیڑے نہیں وہ افسانے

ہر ایک چیز ہے منسوب اپنی فطرت سے
لباسِ شمع میں، خود جل رہے ہیں پروانے

بڑے سلوک سے، طے ہو رہی ہے راہِ جنوں
یہ کون راہبرِ عشق ہے خُدا جانے

وہ تیری گرمیِ محفل کہاں گئی ساقی
پڑے ہوئے ہیں جو سنسان آج میخانے

وہ نامراد جہاں ہوں کہ ڈوبنے جو گیا
تو ڈال لی شکن، اپنی جبیں پہ دریا نے

رضائے دوست میں گم ہو کے رہ گیا ہوں میں
وصال و ہجر کی شرطیں مری بلا جانے

ادب کی راہ میں، اُبھرا ہوں نقش کی صورت
یہ اور بات ہے دنیا ابھی نہ پہچانے

کچھ ایسے اب بھی ہیں، رندانِ تشنہ لب جو ہر
جدھر نگاہ اُٹھا دیں، ہزار میخانے



جو کبھی حل نہ ہوئی، آج بھی مشکل ہے وہی
منزلِ عشق میں، دشوارِیِ منزل ہے وہی

عشق ہوتا ہے جہاں، موردِ الزامِ جنوں
ہوشیار، اے دلِ بیتاب یہ محفل ہے وہی

جُستجو میں تری جس راہ سے گزرے تھے کبھی
آج دُنیا کے لئے، جادۂ منزل ہے وہی

اب مرے بعد وہ ہنگامۂ خاموش کہاں
یوں تو محفل میں تری، گرمیِ محفل ہے وہی

فطرتِ دل ہے ازل ہی سے غمِ عشق پسند
جس سے دُنیا ہے گریزاں، مری منزل ہے وہی

یوں تو ہر سینے میں، اک شعلۂ غم ہے بیتاب
ہو میسّر غمِ کونین جسے، دل ہے وہی
تہ نشیں ہو بھی چکے، ڈوبنے والے لیکن
جوشِ طوفاں ہے وہی، شورشِ ساحل ہے وہی
پُرسشِ غم بھی مجھے راس نہ آئی جو تھی
وحشتِ دل ہے وہی، بیخودیِ دل ہے وہی

آج بھی یوں تو نہیں جوشِ محبّت میں کمی
ہاں مگر دل کے دھڑکنے کا وہ انداز نہیں



معجزے ہیں یہ تمہارے نام کے
پھر گئے رُخ، گردشِ ایام کے
جُراَتِ پرواز ہونی چاہئے
آپ کُھل جائیں گے حلقے دام کے
آشیاں پر، برق نے سجدے کئے
چار تنکے، نکلے کتنے کام کے
بخش دے، جو لذّتِ سوزِ دوام
منتظِر ہیں، ہم تو اُس پیغام کے
چشمِ ساقی، سے برستی ہے شراب
دَور چلتے ہیں مےِ بے نام کے

لذّتِ راہِ طلب، جوہرؔ نہ پوچھ
لُطف ہیں آغاز میں، انجام کے

زندگی اِک زخم ہے ہنستا ہوا
زندگی کو کس قدر سمجھا ہوں میں

غالبؔ کی صد سالہ تقریب کے موقع پر لال قلعہ دلّی میں ہونے والے مشاعرے میں پڑھی گئی۔
جوہرؔ



شاید ابھی طلب ہے، مقامِ اثر سے دور
رہرو بھٹک رہا ہے تری رہگذر سے دور

دُنیا کا ہر مقام ہے، میری نگاہ میں
منزل ہے کون سی مرے عزمِ سفر سے دور

چاہے ہے کچھ سکون، تو اے ہمنوائے شوق
آ میرے ساتھ، فتنۂ شام و سحر سے دور

اپنا سرِ نیاز کہیں خم نہ ہو سکا
آئے تھے اور در بھی، ترے سنگِ در سے دور

بجلی کا ڈر کسی کو، کسی کو خزاں کا خوف
کوئی نہیں چمن میں غمِ بال و پر سے دور

آئندہ زندگی جسے کہتے ہیں آخرت
میری نظر سے دور، نہ تیری نظر سے دور

دیر و حرم کی راہ میں بھٹکے ہم اس طرح
دل سنگِ در کے پاس، نظر سنگِ در سے دور

کس درجہ بدنصیب ہے جو بھر وہ راہرو
ہو جائے وقتِ شام جسے اپنے گھر سے دور



بہ ادائے بے نیازی، بہ خلوصِ والہانہ
وہ نظر جہاں بھی اُٹھی، وہیں جُھک گیا زمانہ

مجھے یاد بھی اگر ہو، تو سُنے گا کیا زمانہ
وہی حُسن کی کہانی، وہی عشق کا فسانہ

اُسے اپنی زندگی پر ہے غرور وناز کیا کیا
ترے دل سے ہو گیا ہے، جسے ربطِ غائبانہ

بہ ہزار علم و حکمت، بہ ہزار فہم و دانش
ترے حُسن کی حقیقت، نہ سمجھ سکا زمانہ

یہی دل کہ دیکھتا ہوں، جسے اب بُجھا بُجھا سا
یہی دل رہا ہے برسوں، شبِ غم چراغِ خانہ

مرا عزم، میری ہمّت، مرا حوصلہ سلامت
نہ جلا سکے گی بجلی، کبھی میرا آشیانہ

ترے غم سے بھی ہے نازک، مرے شعر کی لطافت
نہ اُٹھا سکے گا تو بھی، مرا نازِ شاعرانہ

مری زندگی محبّت، ترا کام بغض و نفرت
تجھے ہمنشیں مبارک، ترا عزمِ باغیانہ

یہ چمن مرا چمن ہے، مگر آہ اِس چمن میں
مرے واسطے ہے جو ہے، نہ قفس نہ آشیانہ



فضائے لالہ و گُل میں، بہاروں کا بھروسہ کیا
نظر میں حُسن پیدا کر، نظاروں کا بھروسہ کیا

تلاطُم خیز موجوں میں، کناروں کا بھروسہ کیا
سفینہ خود سنبھال اپنا، سہاروں کا بھروسہ کیا

نہ جانے کب مجھی کو موردِ الزام ٹھہرادیں
تری معصوم نظروں کے اشاروں کا بھروسہ کیا

شبِ تاریک میں اے راہِ منزل ڈھونڈنے والو!
دِلوں کے داغ چمکاؤ، ستاروں کا بھروسہ کیا

جنوں اب گامزن ہے، بے خطر جن رہگذاروں میں
خرد کے دَور میں اُن رہگذاروں کا بھروسہ کیا

خزاں کا نام سُن کر، رنگ فق ہوتا ہی پھولوں کا
چمن کا آسرا کیسا، بہاروں کا بھروسہ کیا

یہاں اک اک نفس پر صبر و استقلال ہے لازم
جہادِ زندگی میں، بیقراروں کا بھروسہ کیا

یہ مانا رازداروں کی نہیں کوئی کمی لیکن
مقامِ دل میں جو ہر رازداروں کا بھروسہ کیا



اِتنا تو ارتباط ہو اُس سنگِ در کے ساتھ
جُھک جائے کائنات بھی سجدے میں سر کے ساتھ

احسانِ غیر، اور رہِ منزلِ حبیب
ہے ننگِ جُستجو، جو چلوں راہبر کے ساتھ

وہ ذرہ ہائے دل بھی، بڑے خوش نصیب ہیں
وابستہ ہو گئے، جو تری رہ گذر کے ساتھ

منزل کی فکر کیا ہے، کہ اے رہ نوردِ شوق
منزل تو ہر قدم پہ ہے، عزم سفر کے ساتھ

دیکھا کئے ہیں، خوب نشیب و فرازِ دہر
کھیلا کئے ہیں، فتنۂ شام و سحر کے ساتھ

غیرت کا ہے مقام گریباں کے واسطے
دامن نے جو سلوک کیا چشمِ تر کے ساتھ

گذرے ہیں ہم پہ عشق میں ایسے بھی حادثے
اک ربطِ خاص ہے جنھیں تیری نظر کے ساتھ

جو تھے ہجومِ شوق میں اتنا تو گم نہ ہو
اپنی خبر بھی چاہیئے اُن کی خبر کے ساتھ

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ۔



کھُل سکیں گے، نہ پھر اسرارِ نہاں میرے بعد
کون سمجھے گا، محبّت کی زباں میرے بعد

یورشِ برق تھی، اک میرے نشیمن کے لئے
صحنِ گُلشن سے اُٹھا، پھر نہ دھواں میرے بعد

میں نے اک آہ میں، رودادِ محبّت کہہ دی
لوگ کرتے رہے، تفسیرِ فُغاں میرے بعد

کچھ تو پہلے ہی سے، بے رنگ تھے ہستی کے نقوش
اور مُبہم ہوئی، تصویرِ جہاں میرے بعد

وہ فسانہ، نگہِ حُسن نے چھیڑا تھا جسے
کس کو معلوم کہ ہو ختم کہاں میرے بعد

مشعلِ راہِ وفا تھا مرا ہر نقشِ قدم
منزلیں ہوگئیں بے نام و نشاں میرے بعد

میرے ہی دم سے ہے ہر تازہ تغیر جو ھر
ختم ہو جائے گا آشوبِ جہاں میرے بعد



کوئی شے پاس ہے، نہ کوئی دور
اپنی اپنی، مگر طلب کا شعور
اے خوشا، جلوہ گاہِ قُرب وحضور
زندگی ہوگئی مُجسّم نور
بات کیا ہے، کہ مدّعائے دل
بھول جاتا ہوں، جاکے اُن کے حضور
ہائے کتنا لطیف ہے وہ غم
جس نے بخشا ہے، زندگی کا شعور
دیکھتا ہوں، کچھ ایسے جلوے بھی
جو بظاہر، نظر سے ہیں مستور

لُطف مل جائے سعیِ پیہم کا
کاش ہو جائے اور منزل دور

میں کسی حال میں سہی اے دوست
اک تعلّق مگر ہے تجھ سے ضرور

شکوۂ دوست، برملا جوؔ ھر
اہلِ دل کا نہیں ہے یہ دستور

آپ کا ساتھ جب سے چھوٹا ہے
زندگی کا سفر ہے بے رونق



تعمیرِ آشیاں ہو، کہ حفظِ چمن کی بات
دونوں کے سلسلے میں ہے دار و رسن کی بات

خوش ہوں کہ اہلِ ہوش کی محفل میں آج تک
سمجھا نہ کوئی بھی، مرے دیوانہ پن کی بات

دونوں کی زندگی کا ہے مقصود الگ الگ
اک راہبر کی بات ہے، اک راہزن کی بات

حُسنِ قبا پہ لالہ و گُل بھی ہیں دم بخود
اب کیا کوئی بتائے ترے پیرہن کی بات

ہر بانکپن کے ساتھ ہے، اک حُسنِ سادگی
ہر سادگیِ حُسن میں ہے بانکپن کی بات

جدّت ہمیں پسند، قدامت اُنھیں قبول
یہ تو ہے اپنے اپنے مذاقِ سخن کی بات

اُس انجمن میں ذکر ترا ہی چھِڑا رہا
پہنچی جس انجمن میں تری انجمن کی بات

جب تک کسی کے رُخ کا رہا ذکر بزم میں
آنے نہ پائی لب پہ گُل و یاسمن کی بات

جوہرؔ، تجھے غزل پہ یہاں داد کیا ملے
سمجھیں گے اہلِ فن ہی فقط اہلِ فن کی بات



وہ دل کشی، وہ روشنیِ بام و در گئی
تم کیا گئے، کہ رونقِ شام و سحر گئی

چشمِ کرم کی خیر، عجب کام کر گئی
بے رنگیِ حیات میں سَو رنگ بھر گئی

میں انتظار ہی میں رہا اور زندگی
چُپ چاپ، میرے پاس سے ہو کر گذر گئی

اشکوں کی بوند، یار کی تصویر دیکھ کر
اوراقِ گُل پہ صورت شبنم بکھر گئی

عہدِ وفائے دوست ہو یا انتظارِ دوست
ہر بات اعتبار کی حد سے گذر گئی

آئی جو تیری یاد، تو مانندِ بوئے گُل
ساری فضائے شوق کو مخمور کر گئی

اتنا تو میری آہ کا، ردِّ عمل ہوا
اُن کی جبیں پہ ایک شکن سی اُبھر گئی

ملتے ہی آج اُن کی جنوں آفریں نگاہ
مجھ کو ہر ایک چیز سے بیگانہ کر گئی

جوہرؔ نہ پوچھ، عُمرِ گریزاں کی سرگذشت
جس طرح بھی گذر گئی، آخر گذر گئی



جہانِ عشق میں، بے زخم کوئی دل نہیں ملتا
نشاں ملتا ہے قاتل کا، مگر قاتل نہیں ملتا

خدا اُس ڈوبنے والے کی ہمّت کو جواں رکھّے
کہ ساحل کے قریب آکر، جسے ساحل نہیں ملتا

کسی کو طور کی دعوت، کسی سے حشر کا وعدہ
تجھے شاید کوئی دیدار کے قابل نہیں ملتا

جو ملتا ہے مقامِ عشق میں آوارہ ملتا ہے
کوئی بھی کارواں، آسودۂ منزل نہیں ملتا

مشیّت، فیصلہ کرتی ہے خود ہی ظرفِ انساں کا
کسی کو غم نہیں ملتا کسی کو دل نہیں ملتا

بھٹکتے پھر رہے ہیں، آج لاکھوں کارواں ہر سُو
مگر افسوس، کوئی رہبرِ کامل نہیں ملتا

محبّت ہے وہ بحرِ بے کراں اے دل جہاں اکثر
سفینے ڈوب جاتے ہیں، مگر ساحل نہیں ملتا

نقاب اُٹھتے ہی گُم ہو جائیں جو نظریں تجلّی میں
اُنھیں جوہر، مذاقِ دید کا حاصِل نہیں ملتا



نہ اُمیدوں سے وابستہ، نہ ارمانوں سے وابستہ
ہماری زندگی ہے، غم کے طوفانوں سے وابستہ

وہی غم، اصل میں صد حاصلِ کونین ہوتا ہے
حقیقت میں، جو غم ہوتا ہے انسانوں سے وابستہ

جنھیں فرزانے اپنے نام سے منسوب کرتے ہیں
یہ جتنے بھی چمن ہیں، سب ہیں دیوانوں سے وابستہ

عجب انسان ہیں، اِس دور کے انسان بھی یارو
نہ اپنوں سے کوئی نسبت، نہ بیگانوں سے وابستہ

ہجومِ یاس، دردِ شوق، یادِ شامِ تنہائی
نہ جانے، زندگی ہے، کتنے عنوانوں سے وابستہ

فراقؔ[1] و جوہرؔ[2] و آزادؔ[3] و ملاؔ[4] سے ذرا پوچھیں
جو کہتے ہیں کہ اُردو ہے مسلمانوں سے وابستہ

ابھی کچھ اور بربادی ہے گُلشن کے مقدّر میں
نشیمن ہیں ابھی کچھ اور ویرانوں سے وابستہ

سکوں کی جُستجو اُس گھر میں ہے اِک لفظِ بے معنی
وہ گھر، جس کی حفاظت ہو نگہبانوں سے وابستہ

اُنھیں کے واسطے ہے عشرتِ ساحل یہاں جوہرؔ
سفینے ہو چکے ہیں، جن کے طوفانوں سے وابستہ

---

[1] جناب رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری [2] راقم الحروف ۔ [3] پروفیسر جگن ناتھ آزاد
[4] پنڈت آنند نرائن ملاؔ



یہ تو منظور ہے ساقی کہ مجھے جام نہ دے

ہاں مری تشنہ لبی کو مگر الزام نہ دے

ہائے وہ شب، کہ جو مہکے نہ تری زُلفوں سے

آہ، وہ شام، جو دل کو ترا پیغام نہ دے

اے غمِ دوست، تجھے اپنی جفاؤں کی قسم

ایک لمحے کے لئے بھی مجھے آرام نہ دے

جس سے توہین ہو، ساقی ترے میخانے کی

ایسے کم ظرف کے ہاتھوں میں کبھی جام نہ دے

غمِ جاناں کے سوا، اور بھی کچھ سوچ سکوں

اتنی فرصت بھی مجھے، گردشِ ایّام نہ دے

مجھ کو ہر تہمتِ بے نام، گوارا ہے مگر
میری معصومیِ تقدیر کو الزام نہ دے
غمِ ایّام، غمِ عشق، غمِ ناکامی
یہی کافی ہیں مجھے، اور کوئی انعام نہ دے
دل کو احساسِ محبت سے جو غافل کر دے
دینے والے مجھے ایسی سحر و شام نہ دے
میں ہوں، اک رندِ خراباتِ جہاں، لے جوہر!
میری آشفتہ سری کو کوئی الزام نہ دے

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی۔



محبت، اپنا خود آئین بھی ہے
محبت، کفر بھی ہے، دین بھی ہے
تڑپنے کا سلیقہ ہو تو ناداں
تڑپنے میں بڑی تسکین بھی ہے
محبت، ہے بظاہر جتنی سادہ
مزاجاً، اُتنی ہی رنگین بھی ہے
پرِ پرواز، اور خوفِ اسیری
پرِ پرواز کی توہین بھی ہے
اگر دل کو نہ راس آئے غمِ عشق
تو پھر یہ حادثہ، سنگین بھی ہے

کئی دن سے عجب عالم ہے جو ہر
طبیعت شاد بھی، غمگین بھی ہے

ادا کیوں کر ہو وہ لفظ و بیاں سے
جو نسبت ہے جبیں کو آستاں سے



انقلابِ وقت، جب پل کر جواں ہو جائے گا
اور ہی کچھ رنگِ تصویرِ جہاں ہو جائے گا

کیا خبر تھی اس قدر وہ مہرباں ہو جائے گا
مجھ کو جینا بھی، محبت میں گراں ہو جائے گا

آشیاں کی خیر، آ سکتا ہے ایسا دور بھی
جب ہر اک تنکا حریفِ باغباں ہو جائے گا

ضبطِ غم نے اور بھی غم کو نمایاں کر دیا
کیا خبر تھی درد ہی دل کی زباں ہو جائے گا

رہ گذر میں ایک ایسا موڑ بھی آئے گا جب
راہزن کے ساتھ میر کارواں ہو جائے گا

جس زمیں پر آپ کے نقشِ قدم پڑ جائیں گے
اُس زمیں کا ذرّہ ذرّہ آسماں ہو جائے گا

عشق میں دل کی حقیقت کو نہ پوچھ اے ہمنشیں
یہ وہ قطرہ ہے جو بحرِ بیکراں ہو جائے گا

وہ تو یہ کہیے کہ جذبِ عشق کام آ ہی گیا
میں تو سمجھا تھا کہ یہ بھی رائگاں ہو جائے گا

آشیاں کو پھر سے میں ترتیب تو دے لوں مگر
ڈر یہ ہے برہم مزاجِ باغباں ہو جائے گا

میری چشمِ دل سے اے جوہر کسی کی یاد میں
اشک جو ٹپکے گا زیبِ داستاں ہو جائے گا



جلوہ فگن ہے رحمتِ پروردگار آج
ہے میکدے پہ سایۂ ابرِ بہار آج

محسوس کر رہا ہوں دل و جاں میں تازگی
پیغامِ زیست، لایا ہے پیغامِ یار آج

طرزِ جفائے دوست کی معصومیاں نہ پوچھ
حالِ دلِ تباہ پہ آتا ہے پیار آج

دُنیائے حُسن و عشق کی ہر شے ہے مُضطرب
کچھ یوں تڑپ رہا ہے دلِ بے قرار آج

اک جانِ انتظار کی آمد کے شوق میں
ٹھہری ہوئی ہے گردشِ لیل و نہار آج

جو ہر سلوکِ اہلِ وطن، آہ کچھ نہ پوچھ
اپنے وطن میں بھی ہوں غریب الدیار آج

بے کیف عمرِ خضر بھی لے کر میں کیا کروں
دو لمحے بھی بہت ہیں ترے انتظار کے



کہاں کے لالۂ و گُل، صحنِ گُلستاں کیسا
قفس نصیب، تجھے شوقِ آشیاں کیسا

یہ بے رُخی، یہ تغافُل ہے درمیاں کیسا
تمھارے ہو گئے جب ہم تو اِمتحاں کیسا

جبینِ شوق سلامت، تو اپنا دل کعبہ
شعورِ سجدہ اگر ہے تو آستاں کیسا

تلاشِ دوست میں گُم کردہ راہِ شوق ہوں میں
کہاں کی منزلِ مقصود، کارواں کیسا

نہ جذب و جوش، نہ کیف و اثر، نہ سوز و گداز
فغاں کے بعد ہوں شرمندۂ فغاں کیسا

جلے ہوئے تو نشیمن کو اک زمانہ ہوا
پھر اُٹھ رہا ہے گُلستاں میں، یہ دھواں کیسا

ابھی سے، غنچہ و گُل کیوں اُداس ہیں جوہر
ابھی بہار ہے، اندیشۂ خزاں کیسا



دل کے نازک معاملات، نہ پوچھ
بڑھ نہ جائے کہیں یہ بات نہ پوچھ
رازِ سربستۂ حیات نہ پوچھ
اور سب پوچھ، بس یہ بات نہ پوچھ
شرحِ ناکامیِ حیات نہ پوچھ
حاصلِ عمرِ بے ثبات نہ پوچھ
دل پہ گذری، جو واردات نہ پوچھ
اُن کی نظروں کی کوئی بات نہ پوچھ
ذکرِ آغازِ التفات نہ چھیڑ
حالِ انجامِ التفات نہ پوچھ

میرا انجام، دیکھ آنکھوں سے
انتہائے غمِ حیات نہ پوچھ

عِشق کو، جاں بلب ہی رہنے دے
رازِ ترکِ تعلقات، نہ پوچھ

تجھ کو سمجھاؤں کس طرح ناصح
ہیں محبت کے یہ نکات، نہ پوچھ

عظمتِ دیر و کعبہ بھی تسلیم
لیکن اُس آستاں کی بات نہ پوچھ

ہر نفس، انقلابِ نَو در پیش
کیسے گذرے گی، یہ حیات نہ پوچھ

مجھ کو کتنے، عزیز ہیں جوہرؔ
یہ محبت کے حادثات نہ پوچھ



نفَس نفَس میں زندگیِ جاوداں لئے ہوئے
خیالِ دوست آگیا قرارِ جاں لئے ہوئے

دمِ سحر، چمن میں آج کون مسکرادیا
روش روش ہے اک بہارِ گلفشاں لئے ہوئے

جنونِ سجدہ چاہیئے، تلاشِ سنگِ در ہے کیا
کہ خود جبینِ شوق ہے اک آستاں لئے ہوئے

وہی ہے فخرِ گُلستاں، وہی ہے نازشِ بہار
جو بجلیوں کے سائے میں، ہے آشیاں لئے ہوئے

کوئی اگر سُنے تو ہے، فضائے دہر آج بھی
دُکھے ہوئے دلوں کی کچھ کہانیاں لئے ہوئے

وہ وقت ہائے کیا ہوا، وہ دور اُف کہاں گیا
کہ جب حیات تھی، سکونِ جاوداں لئے ہوئے

فسانۂ غم و اَلم، نہ چھیڑ جو ہرِ حزیں
کہ زندگی ہے، زندگی کی تلخیاں لئے ہوئے



رہروِ غم، جو تیز گام نہ ہو
زندگی کا سفر تمام نہ ہو

عقل کو، جس نے روشنی بخشی
وہ جنوں ہی کا فیضِ عام نہ ہو

دھڑکنیں دل کی غور سے سُن کر
سوچتا ہوں، ترا پیام نہ ہو

موت سے، دور بھاگنے والو!
زندگی، موت ہی کا نام نہ ہو

میری دُنیائے عشق کو یارب
وہ سحر دے کہ جس کی شام نہ ہو

وہ محبت ہی کیا، جو ہو مخصوص
وہ مسرت ہی کیا، جو عام نہ ہو

وہ مئے خاص، دے مجھے ساقی
جس کا پینا کبھی حرام نہ ہو

دل سے دل، یوں بھی ملتے ہیں جوہر
کوئی نامہ نہ ہو، پیام نہ ہو

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ جموّں



سکوتِ غم کو بھی، طرزِ بیاں کہنا ہی پڑتا ہے
محبّت میں خموشی کو، زباں کہنا ہی پڑتا ہے

کبھی ہم مہرباں کو مہرباں کہتے ہوئے ڈرتے ہیں
کبھی نامہرباں کو، مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

تقاضائے وفا کہیے، اسے یا مصلحت کہیے
زباں رکھ کر بھی خود کو بے زباں کہنا ہی پڑتا ہے

کہاں تک ضبط کا دامن نہ چھوڑیں ہم بھی انساں ہیں
کسی سے تو کبھی، دردِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود منزل سے گھبرا کر
غبارِ کارواں کو کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

میسر جس قفس میں ہو، گلستاں کی سی آزادی
تو پھر ایسے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

گذر جاتے ہیں جو لمحے، تری یادوں کے سائے میں
اُنھیں تسکینِ دل، آرامِ جاں کہنا ہی پڑتا ہے

جہاں صیاد رکھ دیتا ہے، کچھ تنکے نشیمن کے
ہمیں پھر اُس جگہ کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

حریمِ ناز میں، فریاد کا کیا کام اے جوہرؔ
فُغاں کو بھی یہاں، ننگِ فُغاں کہنا ہی پڑتا ہے



کارنامے ہیں، ابھی راز ہیں دیوانوں کے
یہ فسانے، ابھی مُحتاج ہیں عنوانوں کے

پاؤں بڑھتے ہیں، جدھر بھی ترے دیوانوں کے
ذرّے تعظیم کو اُٹھتے ہیں بیابانوں کے

دیکھ کر کارِ نُمایاں ترے دیوانوں کے
حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں فرزانوں کے

دولتِ کعبۂ ایمان و یقیں اُن کو ملی
ہو گئے جن پہ عیاں، راز صنم خانوں کے

خشک لب، دست بہ دل، برہنہ پا، خاک بسر
خاص انداز یہی ہیں، ترے دیوانوں کے

آرزو ہی سے ہے، دُنیائے محبّت کا وجود
زندگی رقص میں ہے بھیس میں ارمانوں کے

اُن سفینوں کے مقدّر پہ ہنسی آتی ہے
آ سکیں، جو نہ مقابل، کبھی طوفانوں کے

ملتی رہتی ہے، ہمہ وقت گُلستاں کی خبر
ہم قفس میں بھی ہیں، ممنون نگہبانوں کے

شمع کی سمت، بڑھے جاتے ہیں بے خوف وخطر
کوئی دیکھے تو سہی، حوصلے پروانوں کے

دل میں کچھ اور ہے، چہرے سے نمایاں کچھ اور
کیسے بدلے ہوئے، حالات ہیں انسانوں کے

ہائے وہ قطرۂ بے مایہ کہ جس نے جوؔہر
پرورش پائی ہے آغوش میں طوفانوں کے



جواں رکھیں، جو ہم راہِ طلب میں حوصلے دل کے
تو اک اک گام پر کھُلنے لگیں اسرار منزل کے

جنھیں دُنیا، مہ و انجم، گُل و لالہ سمجھتی ہے
یہ ہیں بکھرے ہوئے ذرّے، مری خاکسترِ دل کے

ہمیں جب غم نہیں طوفاں سے ہم آغوش ہونے کا
مسرّت پھر یہ کیوں چہروں پہ ہے، یارانِ ساحل کے

نہ کر ترکِ تعلق پر مجھے مجبور اے ناصح!
بہت محکم ہوا کرتے ہیں ناداں فیصلے دل کے

نگاہِ امتیازِ جلوہ و پردہ کریں پیدا
گماں محمل نشیں کا ہے جنھیں پردوں پہ محمل کے

نہ ہو مایوس، اے دریائے غم میں ڈوبنے والے
کبھی طوفاں میں بھی، آثار مل جاتے ہیں ساحل کے

سمجھتی ہے، نظر اُن کی جسے شایانِ غم جوہر
سِکھا دیتی ہے، سب آداب اُس کو عشقِ کامل کے

محبت کیا ہے جوہر محرمِ اسرار ہو جانا
خودی کا ہوش آنا روح کا بیدار ہو جانا



نہ حدودِ وہم و گماں میں ہے، نہ جہانِ ہوش و خبر میں ہے
وہ جو ایک حُسنِ لطیف تر، مری چشمِ جلوہ نگر میں ہے

غمِ ہجر کی ہے وہ تیرگی، کہ دُھواں دُھواں سا نظر میں ہے
نہ وہ دل کشی شبِ ماہ میں، نہ وہ حُسن نورِ سحر میں ہے

مٹے زندگی تو مٹا کرے، لہو دل کا ہو تو ہوا کرے
وہ غریب شکوہ ہی کیا کرے، جو فریبِ شام و سحر میں ہے

مرا رازِ دل جو نہ کہہ سکا، جو ٹپک سکا جو نہ بہہ سکا
جو امانتِ غمِ عشق ہے، وہی اشک دیدۂ تر میں ہے

وہی بے حسی، وہی بے بسی کوئی زندگی ہے یہ زندگی
نہ سُرورِ گریۂ شب میں ہے، نہ گدازِ آہِ سحر میں ہے

نہ وہ شوق ہیں مرے راہبر، نہ مجھے سکوں نہ تجھے سکوں
مری زندگی بھی سفر میں ہے، تری زندگی بھی سفر میں ہے

یہ شبِ فراق کی لذتیں، بہ خدا بہت ہی عجیب ہیں
کوئی شامِ غم سے ہے مطمئن، کوئی انتظارِ سحر میں ہے

نہ ملے گا جو ہے بے خبر، کبھی پھر یہ لمحۂ مختصر
تجھے دیکھنا ہو تو دیکھ لے، ابھی کوئی حدِ نظر میں ہے



وہ سامنے ہیں، پھر بھی مجالِ نظر کہاں
ہر چند ہوش میں ہوں، مگر اس قدر کہاں

وارفتگانِ دید کو، اتنی خبر کہاں
جلوے تو ہر طرف ہیں، شعورِ نظر کہاں

پہنچا کہاں سے آج مقامِ بشر کہاں
لیکن خود اپنی، بے خبری کی خبر کہاں

دل کو سکوں نصیب، یہاں لمحہ بھر کہاں
منزل گہِ حیات میں، غم سے مفر کہاں

ہر وقت، جب نگاہ تھی آئینۂ جمال
کیا جانیئے، وہ شام کہاں ہے، سحر کہاں

جو میرے آشیانے کے نزدیک جاسکے
اے ہم قفس، یہ جرأتِ برق و شرر کہاں

ٹھہرے نہ جانے پائے طلب کس مقام پر
لے جارہا ہے دیکھئے ذوقِ سفر کہاں

راہِ جنونِ عشق میں، کیا دخلِ آگہی
اہلِ خرد کی بات یہاں معتبر کہاں

طولِ حیات ایک شبِ غم میں کٹ گئی
جوہرؔ مرے نصیب میں لطفِ سحر کہاں



نہ آئے دَور مجھ تک غم نہیں ہے
نظر ساقی سے ملنا کم نہیں ہے

مآلِ غم، بقدرِ غم نہیں ہے
کہ آنکھیں نم ہیں، دامن نم نہیں ہے

زمانے کو، شعورِ غم نہیں ہے
یہاں، کوئی مرا محرم نہیں ہے

وہ بزمِ گُل بھی ہے، بے رنگ جس میں
کوئی شعلہ، کوئی شبنم نہیں ہے

نوائے ساز بھی دل کش ہے لیکن
سکوتِ ساز بھی کچھ کم نہیں ہے

غمِ محبوب سے بڑھ کر جہاں میں
نشاط انگیز کوئی غم نہیں ہے
کہاں تک روئیں تیری یاد میں ہم
علاجِ تشنگی شبنم نہیں ہے
غمِ دوراں کو کیا اپناؤں جو ہر
غمِ جاناں کی لذّت کم نہیں ہے

سُنا کر اپنا اپنا قصۂ غم
یہاں ہر صاحبِ افسانہ چُپ ہے



ہوئی جب شمع روشن، بزم میں پروانے جاگ اُٹھے
جنوں نے اس طرح انگڑائی لی، دیوانے جاگ اُٹھے
بہ فیضِ چشمِ ساقی، بزم میں پیمانے جاگ اُٹھے
اِدھر گردش میں جام آئے اُدھر میخانے جاگ اُٹھے
یہ کس جانِ بہاراں نے، بہ اندازِ کرم دیکھا
مقدر کھل گئے صحراؤں کے ویرانے جاگ اُٹھے
خُدا معلوم کیا تاثیر تھی رندوں کی آمد میں
قدم رکھا ادھر اور اُس طرف میخانے جاگ اُٹھے
کسی کو تو نوائے درد شن کر، جاگنا ہی تھا
اگر اپنے نہیں جاگے تو کیا، بیگانے جاگ اُٹھے

موذّن کی صدائے دل نشیں کا یہ اثر دیکھا
حرم والوں کی آنکھیں کھل گئیں بت خانے جاگ اُٹھے
یہ کس نے ذکر چھیڑا اُس سراپا ناز کا جوہر
کہ حُسن و عشق کے سوئے ہوئے افسانے جاگ اُٹھے



ہم سفر یہ کون، عشقِ معتبر کے ساتھ ہے
ایک طوفانِ تجلّی رہگذر کے ساتھ ہے

آشیاں کو، مل گئی ہو جیسے مُنھ مانگی مُراد
تِنکا تِنکا رقص میں برق و شرر کے ساتھ ہے

عزمِ محکم چاہیے اے طائرِ زنداں نصیب
مقصدِ پرواز تو، خود بال و پر کے ساتھ ہے

دل بھی شامل ہو گیا شاید پرائی آگ میں
کچھ دُھواں سا آج کیوں سوزِ جگر کے ساتھ ہے

خطرۂ دام و قفس، اندیشۂ برقِ تپاں
ہر نفس کیا کیا بلا، اک مُشتِ پر کے ساتھ ہے

اِنقلابِ نَو بہ نَو کی فکر ہی کیا کیجئے
یہ تماشا گردشِ شام و سحر کے ساتھ ہے

وجہِ تسکینِ حیاتِ عشق ہیں دار و رسن
جُستجو کا لُطف، راہِ پُر خطر کے ساتھ ہے

مُدّتوں، مجھ سے رہی جو بے سبب دامن کشاں
اب وہی دُنیا، مری گردِ سفر کے ساتھ ہے

ہر نَفَس ملتا ہے جو ہر اِک پیامِ نَو بہ نَو
میرے دل کو یہ تعلّق اُس نظر کے ساتھ ہے

زندگی کی بھیک بھی خودداریوں کی موت ہے[1]
ورنہ میں چاہوں تو ہر اِک موج ہو ساحل مجھے

---

[1] ۲ر دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء کو میرٹھ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا اور اُسی سلسلے میں ایک گلدستہ بھی شائع ہوا تھا اُس میں میری جو غزل شائع کی گئی ہے یہ اُسی کا ایک منتخب شعر ہے۔ جوہر



لذّتِ عشق ملی تلخیِ آلام کے بعد
اب کسی جام کی حسرت نہیں اس جام کے بعد

شمع کے جلتے ہی، اے دوست بھر آئے آنسو
کل تجھے میں نے بہت یاد کیا، شام کے بعد

ہے یہی عالمِ معراجِ محبّت شاید
اب کوئی نام نہیں لب پہ ترے نام کے بعد

دم لیا راہِ محبّت میں تو دل نے یہ کہا
کہیں منزل بھی ملا کرتی ہے آرام کے بعد

جیسے رگ رگ میں ہو صہبائے محبّت رقصاں
اب ہے کچھ اور ہی عالم، ترے پیغام کے بعد

اُلجھنیں عِشق میں کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہیں
کبھی آغاز سے پہلے، کبھی انجام کے بعد

میں خطا کارِ محبّت سہی، لیکن اے دوست!
زندگی اور نِکھر آئی اِس الزام کے بعد

بادۂ عِشق میں کتنا تھا سرور اے جوؔہر
عُمر بھر ہوش نہ آیا، مجھے اک جام کے بعد



چشمِ ساقی کے کرشمے ہوں کہ پیمانے کی بات
اہلِ مستی ہی سمجھ سکتے ہیں میخانے کی بات

ہر نظر تفسیرِ دل ہے، ہر قدم تفصیلِ راز
اب کوئی سمجھے نہ سمجھے، تیرے دیوانے کی بات

اور بھی کعبے کی عظمت میں اضافہ ہوگیا
دیر والے سُن چکے، جب مجھ سے بُت خانے کی بات

ایک ہی مفہوم ہے، الفاظ ہیں گو مختلف
ایک دیوانے کا کہنا، ایک فرزانے کی بات

شمع بھی آنسو بہا کر، دفعتاً چپ ہوگئی
نامکمل رہ گئی، محفل میں پروانے کی بات

فرق کیا دونوں میں ہے، شیخِ حرم سے پوچھئے
ایک کعبے کی حقیقت، ایک بُت خانے کی بات

ایک دیوانے نے دیوانے کی باتیں جان لیں
ایک فرزانہ مگر سمجھا نہ فرزانے کی بات

رشک اپنی کافری پر آئے ہے کیا کیا مجھے
یاد جب بھی آئے ہے جو ہر صنم خانے کی بات

وہ کہانی جس کو بننا تھا حدیثِ دلبراں
آج بن کر ایک سادہ سی حکایت رہ گئی



تخریب کے پہلو میں مضمر، تعمیر کا ساماں ہوتا ہے
جب شاخِ نشیمن جلتی ہے، گلشن میں چراغاں ہوتا ہے

جو صبر و رضا کے بندے ہیں، دُنیا پہ حکومت کرتے ہیں
مجبور بھی انساں ہوتا ہے، مُختار بھی انساں ہوتا ہے

وہ زخمِ محبت مجھ کو دے، کچھ جس کا مداوا ہو نہ سکے
وہ درد نہیں منظور مجھے، جس درد کا درماں ہوتا ہے

احساسِ خودی، آدابِ خودی، عرفانِ خودی، اِدراکِ خودی
تنویرِ خودی ہو جس دل میں، وہ صاحبِ ایماں ہوتا ہے

ساحل کے طلب گارو شاید یہ راز تمھیں معلوم نہیں
طوفاں میں بھی کشتی ہوتی ہے، کشتی میں بھی طوفاں ہوتا ہے

دستور یہی ہے قدرت کا ، شکوہ نہ کسی کا اور نہ گلہ
اک گھر میں اندھیرا ہوتا ہے، اک گھر میں چراغاں ہوتا ہے

اُس دردِ محبت کے قرباں، جو دین بھی ہے اور دُنیا بھی
اُس کُفر کی عظمت کیا کہیے، جو حاصلِ ایماں ہوتا ہے

تہذیب سے اور اخلاق سے ہے، جذبات کی قیمت دُنیا میں
کردارِ وفا سے اے جوہرؔ، اندازۂ انساں ہوتا ہے

دُنیا کی نظر میں اے جوہرؔ، یکساں ہیں حقیقت میں دونوں
وہ سبزہ جو گریاں رہتا ہے، وہ پھول جو خنداں ہوتا ہے



ہوش و خرد سے اکثر، بیگانے بن گئے ہیں
ہم اُن کی انجمن میں، دیوانے بن گئے ہیں

ساقی کی چشمِ میگوں، جس سمت اُٹھ گئی ہے
مستی برس پڑی ہے، میخانے بن گئے ہیں

جن بستیوں میں اب تک، اہلِ جنوں نہ پہنچے
اُن بستیوں کے آخر، ویرانے بن گئے ہیں

اک میری داستاں کے، عنواں بدل بدل کر
کیا جانے آج کتنے افسانے بن گئے ہیں

اب کے برس، نہ جانے کیسی ہوا چلی ہے
آباد ہو کے گلشن ویرانے بن گئے ہیں

اپنا بنا کے ہم کو، بیگانہ کہنے والے
ہم سب سے تیری خاطر، بیگانے بن گئے ہیں

یہ انقلابِ دوراں، کیا کیا ابھی دکھائے
اپنے بھی آج جو تھے، بیگانے بن گئے ہیں



کہیں ایسا نہ ہو، آغاز ہی انجام ہو جائے

سحر ہونے سے پہلے زندگی کی شام ہو جائے

ترا ملنا، نہ ملنا، منحصر قسمت پہ ہے پھر بھی

یہ ممکن ہی نہیں، سعیِ طلب ناکام ہو جائے

نظریں، حسنِ تاثیرِ نظر، اتنا تو کر پیدا

نظر اُٹھنے نہ پائے، اور جلوہ عام ہو جائے

ذرا ترتیب دے لوں، از سرِ نو آشیانے کو

بس اتنا سا کرم اے گردشِ ایّام ہو جائے

نگاہیں ڈال دوں، جس ظرف پر میں کیف و مستی میں

کبھی پیمانہ بن جائے، کبھی وہ جام ہو جائے

جسے قہرِ الٰہی، کہہ کے دُنیا صبر کرتی ہے
ہمارے واسطے، رحمت کا وہ پیغام ہو جائے

مجھے ڈر ہے، کہ اس حرص و ہوس کے دور میں جوہرؔ
کہیں نامِ محبت بھی، نہ اب بدنام ہو جائے

خدا[1] جانے ابھی کس موج سے طوفان اُٹھ جائے
ابھی شاداں نہ ہوں آثارِ ساحل دیکھنے والے

---

[1] حیدر آباد دکن سے ۱۹۴۸ء میں ایک کتاب انتخابِ عظیم المعروف "بہ چشمۂ عظیم" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ شعر اُسی میں شامل کیا گیا ہے۔ جوہرؔ



یہ معجزہ ہے عشق کا وہم و گماں سے دور

ہیں تیرے دل کے پاس ہوں، چشم جہاں سے دور

قیدِ زماں سے دور، حدودِ مکاں سے دور

میرا جہاں ہے، کشمکشِ دو جہاں سے دور

صحنِ چمن میں، آج یہ کیا دیکھتا ہوں میں

کچھ بال و پر ہیں، بکھرے ہوئے آشیاں سے دور

سجدوں میں اب وہ کیفِ حضوری نہیں رہا

کیا لطف بندگی کا ترے آستاں سے دور

ہوں اِس روش سے، راہِ محبت میں گامزن

ہر کارواں کے ساتھ ہوں، ہر کارواں سے دور

آخر کوئی حساب ہے، اُن کا بھی اے کریم
جو سجدے کر چکا ہوں، ترے آستاں سے دور

اُس زندگی کو مل نہ سکی منزلِ نشاط
وہ زندگی، رہی جو غمِ امتحاں سے دور

جوہر نہ پوچھ، عظمتِ رفتہ کی داستاں
تابندہ اِک ستارہ ہوں، اور آسماں سے دور



جب بھی، اُن سے کلام ہوتا ہے
ہر سخن، نا تمام ہوتا ہے

عشق، جس کے ہزار معنی ہیں
ایک سادہ، پیام ہوتا ہے

وہ نَفَس، جس میں تیری یاد نہ ہو
عاشقی میں، حرام ہوتا ہے

غم کی عظمت نہ جاننے والو!
غم کا بھی اِک مقام ہوتا ہے

کوچۂ دوست کا ہر اک ذرّہ
قابلِ احترام ہوتا ہے

موت، گو تلخ ہے مگر اِس سے
اِک سکونِ دوام، ہوتا ہے
عالمِ بے خودی میں، اے جوہرؔ
اُن سے اکثر کلام، ہوتا ہے



اُس کو سرمایۂ دو جہاں مل گیا
جس کو تیرا غمِ بیکراں مل گیا

نا مکمّل ہی رہتا جنونِ سجود
وہ تو کہیے ترا آستاں مِل گیا

غم نے اس طرح کی عشق میں دل دہی
میں یہ سمجھا کوئی مہرباں مل گیا

خامشی، ترجمانِ طلب بن گئی
حاصلِ ربط و ضبطِ فغاں مل گیا

زندگی بے مزہ کٹ رہی تھی مگر
اے خوشا، تیرا غم ناگہاں مل گیا

عشق میں، اک دلِ بے طلب کیا ملا
زندگی کا، ہمیں رازداں مل گیا

غیرتِ جُستجو سے، قدم رُک گئے
راہ میں، جب کوئی کارواں مل گیا

فکرِ منزل ہو، جوہر اسے کس لئے
جس کو قسمت سے، عزم جواں مل گیا



راہِ جنوں کے، اُف یہ مراحل
جتنے آساں، اُتنے مشکل

جذبہ، شوق، اگر ہو کامل
اپنی جگہ، ہر گام ہے منزل

یا غمِ دوراں، یا غمِ جاناں
اس کے سوا کیا زیست کا حاصل

وہ بھی کیا رُوداد محبت
جس میں نہ تیرا، ذکر ہو شامل

عالمِ عرفاں، اللہ اللہ
چشم بہ جلوہ، گام بہ منزل

اُن کو خبر کیا، طوفانوں کی
جو ہیں ابھی، آسودۂ ساحل

چاہے جدھر ہو، رُخ اے جوکھا
پاؤں اُٹھیں گے، جانبِ منزل

○

نہ سکونِ دل کی ہے جستجو، نہ قرارِ جاں کی تلاش ہے
غمِ عاشقی کی ہے آرزو، غمِ بیکراں کی تلاش ہے

تری یاد حاصلِ زندگی، ترا ذکر نازشِ بندگی
مجھے ذوقِ سجدہ تو مل گیا، ترے آستاں کی تلاش ہے

مری خام کاریٔ شوق نے مری الجھنوں کو بڑھا دیا
کبھی ضبطِ غم کی ہیں کوششیں، کبھی رازداں کی تلاش ہے

مری آرزو ہے ابھی جواں، مری زندگی کو سکوں کہاں
کبھی اِس جہاں کی تلاش ہے، کبھی اُس جہاں کی تلاش ہے

نہ ہو شورشِ غمِ این و آں، تو نفس نفس ہو وبالِ جاں
وہ مری نظر میں ہیں بوالہوس کہ جنھیں اماں کی تلاش ہے

کسے زخم اپنا دکھائے وہ، کہاں اپنے سر کو چھپائے وہ
جو قفس سے چھٹ کے ہے بے وطن، جسے آشیاں کی تلاش ہے

رہِ عاشقی کے یہ مرحلے، یہ قدم قدم نئے راستے
مری جستجو میں ہے کارواں، مجھے کارواں کی تلاش ہے

مرے عزمِ شوق کی منزلیں، ہیں بلند ذوقِ عوام سے
کبھی مہر و ماہ کی جستجو، کبھی کہکشاں کی تلاش ہے

وہی آشیاں کہ جہاں کبھی، مرے سر پہ سایہ برق تھا
مجھے آج جو کہ بے نوا اُسی آشیاں کی تلاش ہے

جس روز سے اُٹھے ہیں، تری رہ گذر سے ہم
گرتے ہی جا رہے ہیں، خود اپنی نظر سے ہم

راہِ طلب میں، دیر بھی ہے، اُن کا در بھی ہے
لیکن سوال یہ ہے، کہ جائیں کدھر سے ہم

اب امتیازِ جلوہ و پردہ، ہمیں کہاں
آگے نکل چکے ہیں، مقامِ نظر سے ہم

دل ہے، وداعِ دوست کے غم میں بجھا بجھا
ہیں دم بخود، خیالِ نمودِ سحر سے ہم

محتاجِ حرف و لفظ نہیں، داستانِ شوق
چاہیں تو دل کی بات، سُنا دیں نظر سے ہم

وہ خود ہیں ساتھ ساتھ، خوشا جذبِ جستجو
چھوٹے تکلفاتِ قیام و سفر سے ہم

اللہ رے احتیاط، کہ اکثر حضورِ دوست
گذرے نظر بچا کے، خود اپنی نظر سے ہم

جو ہر غمِ زمانہ مٹائے گا کیا ہمیں
نظریں ملا چکے ہیں کسی کی نظر سے ہم



دے کر شعورِ دید، مذاقِ نظر کو میں
جلوؤں کو دیکھتا ہوں، کبھی جلوہ گر کو میں
اے کاش، دیکھ لوں جو تجھے لمحہ بھر کو میں
آئینۂ جمال بنا لوں، نظر کو میں
پھر ہے، جبینِ شوق کو سجدوں کی آرزو
پھر ڈھونڈنے چلا ہوں، ترے سنگِ در کو میں
اللہ رے احترام جمالِ حریمِ دوست
یہ تاب ہی نہیں، کہ اٹھاؤں نظر کو میں
عمرِ رواں کے ساتھ، بصد اہتمامِ شوق
طے کر رہا ہوں، منزلِ شام و سحر کو میں

رکھتا نہیں ہوں، منزلِ رفتہ سے کچھ غبار
دامن سے جھاڑ دیتا ہوں، گردِ سفر کو میں

بیدار کر دیا ہے شعورِ حیات کو
کیا کیا دُعائیں دیتا ہوں، اُن کی نظر کو میں

منزل مجھے ملے نہ ملے، کچھ گلہ نہیں
جو ھر نہ ساتھ لوں گا، مگر راہبر کو میں



اشکِ پیہم کی روانی اور ہے
چشمِ دل کی خوں فشانی اور ہے

ختم ہونے کو ہے رودادِ حیات
اک سکوتِ بے زبانی اور ہے

ربطِ الفاظ و معانی سے جُدا
عشق کی معجز بیانی اور ہے

جس سے ہے منسوب دِل کی داستاں
وہ فسانہ، وہ کہانی اور ہے

عشق میں اِس عمرِ فانی کے سوا
اک حیاتِ غیر فانی اور ہے

اُن کے آنے تک، بس اب اے ہمنشیں
اعتبارِ زندگانی اور ہے

یوں تو ہر آنسو ہے طوفاں درکنار
سر سے جو گذرے، وہ پانی اور ہے

پوچھتے ہیں، سُن کے افسانہ مرا
کیا کوئی ایسی کہانی اور ہے

ہم بھی کہہ سکتے ہیں جو ہر دل کی بات
بات، کچھ اُن کی زبانی اور ہے



کچھ اس ادا سے عشق کے صدمے اُٹھائیے
دِل غم سے رو رہا ہو، مگر مُسکرائیے

ہر جذبۂ حیات کو دے کر شعُور نَو
خود زندگی کو پیار کے قابل بنائیے

ہو جائیں حادثاتِ زمانہ بھی سرنگوں
اِس طرح حادثاتِ زمانہ پہ چھائیے

ہو جس کی سادگی سے شکستِ غرورِ حُسن
ایسا بھی اک فریبِ محبت میں کھائیے

فرصت کہاں ہے، گریۂ بے اختیار سے
یہ تم نے کیا کہا، کہ ذرا مسکرائیے

غم بھی ہے، جب حیات کا، اک جزوِ لازمی
کیونکر، غمِ حیات سے دامن بچائیے

اللہ، کتنی تیرہ و تاریک ہے حیات
جی چاہتا ہے شمعِ محبت جلائیے

جو ہر خوشی سے اُن کی جفا کیجیے قبول
لیکن زباں پہ حرفِ شکایت نہ لائیے



شکستِ دل سے، فریاد و فغاں تک بات جا پہنچی
معاذاللہ، محبت میں یہاں تک بات جا پہنچی

کہاں چھپتی، کہ جب دل سے زباں تک بات جا پہنچی
یہی آخر ہوا، اُس بدگماں تک بات جا پہنچی

تجھے الزام کیا دوں، جب تری شانِ ستم یہ ہے
ستم تو نے کئے، اور آسماں تک بات جا پہنچی

چمن والوں میں تخریبِ چمن کا ذکر جب آیا
تو رفتہ رفتہ میرے آشیاں تک بات جا پہنچی

بالآخر بن گیا، دل حسن کا خود آئینہ خانہ
رموزِ عشق و سِرِّ دلبراں تک بات جا پہنچی

ہوا پہلے تو ذکر احباب کی بندہ نوازی کا
مگر آخر، خلوصِ دشمناں تک بات جا پہنچی

قفس میں رازِ تعمیرِ نشیمن کہہ نہ اے ہمدم
اگر در پردہ یہ برقِ تپاں تک بات جا پہنچی

مجھے مٹنے کا اپنے غم نہیں، غم ہے تو بس یہ ہے
جو میرے بعد اُن کے امتحاں تک بات جا پہنچی

محبت کی ہتک ہے، عشق کی توہین ہے جو ھمـ
محبت میں اگر سود و زیاں تک بات جا پہنچی



غمگین رہیں یا شاد رہیں، ہر شب کی سحر ہو جاتی ہے
اک روز کا کٹنا کیا معنی، اک عمر بسر ہو جاتی ہے

جب میری دعائے نیم شبی، مانوسِ اثر ہو جاتی ہے
آغازِ سحر سے پہلے ہی، تنویرِ سحر ہو جاتی ہے

کہتے ہیں کہ خونِ اہلِ وفا، لاتا ہے یقیناً رنگ آخر
سُنتا ہوں کہ میرے ذکر پہ اب، وہ آنکھ بھی تر ہو جاتی ہے

آتا ہے شبِ تنہائی میں، صد شکر اک ایسا وقت کہ جب
آوازِ شکستِ شیشۂ دل، پیغامِ سحر ہو جاتی ہے

جب ذوقِ جنوں کی منزل میں، سب دوست جدا ہو جاتے ہیں
خود گردِ سفر ہی اُٹھ اُٹھ کر دمسازِ سفر ہو جاتی ہے

اِس حسن نظارہ کے صدقے، اُس رُخ سے نقاب اُٹھے نہ اُٹھے
تکمیلِ طلب ہو جاتی ہے، تسکینِ نظر ہو جاتی ہے

رندی بھی اُسی کی ہے رندی، مستی بھی اُسی کی ہے مستی
میخانے میں جس کی لغزش پر، ساقی کی نظر ہو جاتی ہے

آغازِ محبت میں جوہرؔ، دیکھا ہے یہی ہم نے اکثر
جب کوئی تصادم ہوتا ہے، دنیا کو خبر ہو جاتی ہے

اک لوٹنے والے نے جوہرؔ اس شان سے ہم کو لوٹا ہے
یاد آئے گی اپنی بربادی جس گھر کو بھی ویراں دیکھیں گے

اُڑاتا پھر رہا ہے خاک اک دیوانہ برسوں سے
مُرتّب ہو رہا ہے، عشق کا افسانہ برسوں سے

یہاں بھولے سے بھی لب پر نہ حرفِ آرزو آیا
محبّت ہے مگر افسانہ در افسانہ برسوں سے

خُدا معلوم، کس کے منتظِر ہیں میکدے والے
بڑھائی جا رہی ہے، رونقِ میخانہ برسوں سے

رموزِ عشق کی تشہیر، اور میں کیا کہا تم نے
مِری ہستی تو خود مجھ سے بھی ہے بیگانہ برسوں سے

نہ میں وحشی، نہ سرگشتہ، نہ میں بے خود، نہ وارفتہ
نہ جانے کیوں مجھے کہتے ہیں، وہ دیوانہ برسوں سے

خوشا نسبت، کہ سوزِ عشق سے آتش بجاں ہوں میں
سبق لیتی ہے مجھ سے، فطرتِ پروانہ برسوں سے
خدا معلوم، کس کی جستجو، کس کی تمنّا ہے
بھٹکتا پھر رہا ہے، جوہرِ دیوانہ برسوں سے



در خورِ جلوہ و شائستۂ محفل ہو کر
دید کو آئے ہیں تیری، ہمہ تن دل ہو کر

اک معمہ ہی رہا، اہلِ زمانہ کے لئے
رازِ ہستی کبھی آساں، کبھی مشکل ہو کر

لذتِ عشق بھی، کیا چیز ہے اللہ اللہ
کوئی دیکھے تو مرے درد میں شامل ہو کر

مل تو سکتے ہیں یہیں گوشۂ دل میں وہ کہیں
ڈھونڈئیے اُن کو، اگر خود سے بھی غافل ہو کر

ڈوبتے ڈوبتے، جب میں نے پکارا تجھ کو
لے لیا موجوں نے، آغوش میں ساحل ہو کر

پاؤں ٹھہرے نہ کہیں، راہِ جنوں میں جو ھر
نیند آئی مجھے، آسودۂ منزل ہو کر

جو ترجمانِ دلِ کائنات ہوتی ہے
وہی حیات مکمل حیات ہوتی ہے



وطن پر مٹنے والوں نے، وطن کی آبرو رکھ لی

سرِ دار و رسن، دار و رسن کی آبرو رکھ لی

مرے معیارِ فن نے، علم و فن کی آبرو رکھ لی

کہ ہر اہلِ ادب، اہلِ سخن کی آبرو رکھ لی

چمن میں جب وقارِ لالہ و گُل کا سوال آیا

تو پھر ہم نے لہو دے کر چمن کی آبرو رکھ لی

بھری محفل تھی اک پروانۂ بیباک نے جل کر

حضورِ شمع اہلِ انجمن کی آبرو رکھ لی

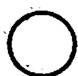
ہزاروں گُل سے وہ اک خارِ بیگانہ غنیمت ہے

کہ جس نے وقت پڑنے پر چمن کی آبرو رکھ لی

وہ غم جس نے مجھے دیوانگیِ شوق بخشی تھی
اُسی غم نے، مرے دیوانہ پن کی آبرو رکھ لی

نہ جانے کتنی معنیٰ خیز تھی، وہ خامشی جس نے
حضورِ دوست، اظہارِ سخن کی آبرو رکھ لی

سلام اُس مردِ حق پر جس نے دے کر جان اے جوہرؔ
وفا کے نام پر، دار و رسن کی آبرو رکھ لی



بیادِ فراق

سونی سونی سی ہے ہر بزمِ سخن تیرے بعد
ختم ہے سلسلۂ عظمتِ فن، تیرے بعد

اپنے افکار سے اُردو کو نوازا تو نے
کس کو اُردو سے ہے اب اتنی لگن تیرے بعد

کبھی غالب تو کبھی میر کے انداز میں شعر
ہے میسر کسے یہ طرزِ سخن تیرے بعد

بحرِ تخیّل میں اگلی سی روانی وہ کہاں
موج زن اب بھی ہیں، گو گنگ و جمن تیرے بعد

محفلِ شعر و ادب میں وہ کہاں جوش و خروش
سرد ہے گرمیٔ بازارِ سخن، تیرے بعد

نوٹ:۔ یہ نظم نما غزل 'نیا دور' لکھنؤ کے فراق نمبر حصہ اوّل جو مارچ، اپریل، مئی ۱۹۸۳ء کے شماروں پر مشتمل ہے شائع ہوئی ہے۔ یہاں یہ 'نیا دور' کے شکریہ کے ساتھ شامل کی جا رہی ہے۔ — جوہر

کس سے پائیں گے سوالوں کا سکوں بخش جواب
دل کو محسوس سی ہوتی ہے گھٹن تیرے بعد

کوئی سُلجھا نہ سکا زلفِ ادب بعد ترے
پڑ گئی گیسوئے اُردو میں شکن تیرے بعد

تیرا ہر شعر نیا، تیرا ہر اسلوب جدید
کون توڑے گا، روایاتِ کہن تیرے بعد

علم[1] و فن میں ترا ثانی کوئی موجود نہیں
ناز کس پر کریں اب اہلِ وطن تیرے بعد

جان دینے کے لئے اپنی بنامِ اُردو
کون پہنچے گا سرِ دار و رسن تیرے بعد

کون رکھے گا یہاں میکدۂ شعر کی لاج
دیکھنا ہے ہمیں رندوں کا چلن تیرے بعد

کیا گذرتی ہے خبر ہے تجھے اے روحِ فراق
دلِ جوہرؔ پہ سرِ بزمِ سخن تیرے بعد

---

[1] یہ شعر فراق نمبر نیا دور لکھنؤ حصہ دوم جو مئی، جون اور جولائی ۱۹۸۳ء کے شماروں پر مشتمل ہے فراق صاحب کی تصویر کے نیچے جو ٹائٹل پیج کے دوسری طرف اندر کے حصے پر چھپی ہے درج کیا گیا ہے — جوہر

جوہر بجنوری میری نظر میں

چندر پرکاش جوہر بجنوری ہمارے عہد کے نامور شاعروں میں ہیں۔ میری ان سے اس موضوع پر کبھی تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی کہ انھیں ہمارے عظیم اور قدیم غزل گو شعراء میں کون کون شاعر زیادہ پسند ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جوہر بجنوری ذہنی طور پر اصغر گونڈوی سے بے حد قریب ہیں۔ پرانی لفظیات کو نئے احساسات سے برتنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ جوہر بجنوری نے اپنے انفرادی تجربات اور اس نئے زمانے کے اجتماعی تصورات کو بخوبی اپنی غزل میں بڑی ہی سلیقہ مندی اور احتیاط کے ساتھ سمویا ہے۔

میں نے جوہر بجنوری کو گذشتہ پچیس ۲۵ برسوں میں ہندوستان کے مختلف مشاعروں میں بغور سُنا ہے۔ کبھی کبھار ایسی مہذب اور سنجیدہ نشستوں میں بھی دیکھا ہے جہاں خالی ترنم یا تحت کی ڈرامائی جدت کوئی اہمیت نہیں رکھتی مگر انھوں نے بڑے ہی وثوق اور اعتماد کے ساتھ بہت اچھے اور معیاری اشعار سنائے ہیں۔

مختصر یہ کہ جوہر بجنوری کا شعری اسلوبِ غزل کی جاوداں روائتوں کا پروردہ ہے۔ وہ اپنے مہذب احساسات کے لئے ایسے مہذب ترین اسلوب، انداز اور لفظیات کا انتخاب کرتے ہیں کہ ان کی غزل سے سنجیدہ عظیم و قدیم شعری سرمائے کی منفرد توسیع ہو جاتی ہے۔

جوہر بجنوری اس عظیم ملک کے کونے کونے میں بڑی عزت اور احترام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدر
میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ
۲۹ر دسمبر ۸۵ء